جلد ۴۳ ۸ — مارچ ۱۹۵۵ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	مارچ سنہ ۱۹۷۵ء مطابق صفر سنہ ۱۳۹۵ھ	جلد ۸۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جسٹس قدیر الدین صاحب کے مقالے پر معروضات کا جو سلسلہ ترجمان القرآن کے گزشتہ شمارے میں شروع کیا گیا تھا اُسے بعض دوسرے اہم موضوعات کی وجہ سے روکنا پڑا ہے۔ آئندہ شمارے میں انشاءاللہ اسے پھر جاری کر دیا جائے گا۔

شیرپاؤ کے قتل سے حکومت جس طرح ناجائز سیاسی فوائد حاصل کرنے میں مصروف ہے وہ اپنی جگہ کتنے ناپسندیدہ ہی سہی لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ کسی بے گناہ انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ قرآن مجید نے ایک شخص کے قتلِ ناحق کو پوری نوعِ انسانی کے قتل سے تعبیر کیا ہے۔ ہمیں اس قتل سے اتنا ہی صدمہ پہنچا ہے جتنا کہ کسی بے گناہ کے قتل سے ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہمارے سینے کے وہ زخم بھی ہرے ہو گئے ہیں جو ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ رفیق، عبدالصمد اچکزئی، مولانا شمس الحق اور اسی طرح کے بعض دوسرے بے گناہوں کے قتل سے لگے تھے۔ ہم اس خوفناک رجحان کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس دن سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ جس دن ہمارے ملکی مسائل افہام و تفہیم کے بجائے "قاضیِ شمشیر" کے ذریعے حل ہونے لگیں۔ مرحوم شیرپاؤ کے قتل کے سلسلے میں ہر سوچنے سمجھنے والے دماغ میں چند سوالات ضرور اُبھرتے ہیں جن کے صحیح اور تشفی بخش جوابات کے بغیر دلوں کی خلش دور نہیں ہو سکتی۔

حکومت کے اپنے ذرائع ابلاغ کی وساطت سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ کابل ریڈیو کئی دنوں سے شیرپاؤ

کے قتل کی دہائی دے رہا تھا اور اس روح فرسا حادثہ سے پہلے بھی ان پر تین چار بار قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم حکومت کی ان اطلاعات کے بارے میں کوئی شک کریں۔ اگر فی الحقیقت شیر پاؤ کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق تھا تو اس قیمتی جان کے تحفظ کے لیے، جو نہ صرف برسر اقتدار طبقہ کی منظور نظر تھی بلکہ انتظامیہ پر پورا اختیار رکھتی تھی، کیا انتظامات کیے گئے؟ ذہن ان انتظامات کی تفصیل سننے کے لیے بیقرار ہیں۔ وہ کوئی عام کارکن نہ تھے کہ بغیر سرکاری حفاظتی دستوں کے یونیورسٹی کی تقریب میں چپکے سے چلے گئے اور وہاں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے انہیں پہلے باقاعدہ دعوت دی گئی ہوگی اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ہی اس کے انعقاد کا اعلان ہوا ہوگا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ظالمانہ حرکت اِس تقریب کے منتظمین اور شرکاء میں سے تو کوئی نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ ان کے لیے بھی اسی طرح جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی جس طرح کہ شیر پاؤ کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ بم نہ صرف حاضرین بلکہ منتظمین کے آنے سے بیشتر ہی رکھا گیا تھا۔ سکیورٹی کے ذمہ دار افراد جو ایسے موقعوں پر غیر معمولی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انہوں نے آخر اس خاص موقع پر کیوں مجرمانہ تغافل سے کام لیا، خصوصاً جب کہ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ جس وزیر باتدبیر کو موت کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں اس کا براہ راست تعلق اُن کے محکمے ہی سے ہے۔ اخبارات کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بم کے دھماکہ کے فوراً بعد بھی پولیس نے حادثہ کے اس مقام کی طرف رجوع نہ کیا اور طلبہ ہی شیر پاؤ کو شدید زخمی حالت میں اُٹھا کر باہر لائے اور جب انہیں ہسپتال میں لے جانے کا انتظام ہو چکا تو پھر پولیس کو وہاں پہنچنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

شیر پاؤ کی موت کے بعد حکومت نے مخالف سیاسی جماعتوں خصوصاً نیپ کے بارے میں جو ناروا طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اس سے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے بار بار یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ نیپ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت کا یہ الزام درست ہے تو اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے باقاعدہ سزا دلوانے کا التزام کیوں نہ کیا گیا؟ اور اگر یہ سب کچھ خاموش تماشائی بن کر برداشت کیا جا رہا تھا تو اب کونسی جلدی تھی کہ شیر پاؤ کے قتل کے ساتھ ہی اُسے کچل دینے کی کوششیں شروع ہوئیں؟ اگر حکومت ماضی میں صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اس جماعت کو اصلاح کے مواقع فراہم کر رہی تھی تو اب اصلاح کے موقع سے اسے اِس قدر عجلت کے ساتھ کیوں محروم

کر دیا گیا ؟ جب معاملہ سپریم کورٹ میں پیش کیا جانا ہی تھا تو کیا یہ بہتر اور موزوں نہ تھا کہ عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے کے بعد ہی اس جماعت کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی ۔ جہاں اس کی "ملک دشمن سرگرمیوں" کو اتنی مدت تک برداشت کیا گیا وہاں پندرہ بیس دن کی "تاخیر" سے آخر کونسی قیامت ٹوٹ پڑنے کا خدشہ تھا ۔

دلوں کے حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کے منصب پر فائز بعض اونچی شخصیتوں نے شیرپاؤ کے قتل پر ایسا ردِ عمل ظاہر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس قتل سے جس قدر صدمہ پہنچا ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی ہے کہ انہیں اپنے مخالفین کو تہس نہس کرنے کا زریں موقع ہاتھ لگا ہے ۔ خان قیوم کے لیے تو اپنے ان جذبات مسرت کو چھپانا مشکل ہو رہا ہے ۔ انہوں نے ۱۸ فروری کو پشاور میں گورنر راج کے نفاذ پر جس شادمانی کا اظہار کیا اس سے اُن کے دل کی کیفیت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ پھر خان صاحب کے ساتھ وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کا یہ ارشاد کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ اُن کے اقدام کی توثیق ہی کرے گا نہ صرف ان حضرات کے اندرونی عزائم کا پتہ دیتا ہے بلکہ اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ ان لوگوں کو نشۂ اقتدار نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے ، جہاں انہیں اپنے منہ سے نکالے ہوئے الفاظ کی اہمیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہا ۔ اُن کے جی میں جو آتا ہے بلا تکلف کہتے چلے جاتے ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ وہ ترنگ میں آکر جو کچھ ارشاد فرما رہے ہیں اسے اس ملک کے لوگ ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا بھی سن رہی ہے اور ان کے ان فرمودات ہی سے بیرون ملک ہمارے مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکے گی ۔ اگر یہ حضرات مسندِ اقتدار پر ہمیشہ کے لیے براجمان رہنے کا عزم رکھتے ہیں تو اس کے لیے انہیں کوئی قرینہ بھی سیکھنا چاہیے ۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے سیاسی وقار بڑھتا نہیں بلکہ گھٹتا ہے ۔

یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن ہے کہ معاشرے میں اس شخص کی قطعاً کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جو کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند نہ ہو کیونکہ اگر وہ کسی اصول کی پابندی کرنے پر آمادہ نہ ہوگا تو اس کے طرزِ عمل کے بارے میں کچھ اندازہ نہ ہو سکے گا ۔ ایک دیوانے اور ہوشمند انسان کے مابین ظاہری اعمال کے لحاظ

سے سب سے نمایاں فرق یہی ہوتا ہے کہ ہوشمند فرد کی طبیعت میں ٹھہراؤ کے علاوہ ایک طرح کی ہمواری اور استواری بھی پائی جاتی ہے اور انسان اُسے دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ خاص حالات میں کونسا ردِ عمل ظاہر کرے گا۔ اس کے مقابلے میں ہوش وخرد سے عاری فرد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت کیا حرکت کر بیٹھے۔

افراد کی طرح قوموں کا اور ملکوں کا وقار بھی اجتماعی ضابطہ اخلاق یعنی دستور اور آئین سے وابستہ ہوتا ہے۔ دستور ہی کسی قوم کا نصب العین اور پھر اس نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کے خطوط متعین کرتا ہے۔ اسی دستور کی مدد ہی سے حکومت اور عوام کے مابین حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ پھر اس دستور کی وجہ سے کسی قوم کے اندر اچھی روایات پرورش پاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب کوئی قوم ایک طویل مدت تک اپنے آپ کو ایک خاص ضابطے کی پابند بنا کر سرگرمِ عمل رہے تو اس کے دل و دماغ میں ان ضابطوں کی پابندی اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ اس کے افراد قانونی گرفت کے خوف کے بغیر ہی ان کی پابندی کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح حکومت اور عوام دونوں کو اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنی قوتوں کو تعمیری راہ پہ لگانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس سے ملک کے اندر استحکام پیدا ہوتا ہے اور بیرونِ ملک قوم کا وقار بڑھتا ہے۔ اس بنا پر دنیا کی کوئی مہذب قوم اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ وہ جس زمین پہ آباد ہے وہ زمین بے آئین رہے اور اس کے عوام اور سربراہ کسی ضابطے کے پابند نہ ہوں کیونکہ دستور اور آئین سے بے نیازی کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ قوم جنگل کے قانون کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ لہٰذا دستور ہر مہذب اور باوقار قوم کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسے پاکستان کی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری قوم کو ابھی تک اس بنیادی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ آزادی سے لے کر ۱۹۵۴ء تک یہ ملک بغیر کسی دستور کے ہی زندہ رہا اور اس طرح اس ملک کے حکمرانوں کو من مانی کارروائیاں کرنے کے کھلے مواقع فراہم ہوتے۔ یہاں کے برسرِ اقتدار طبقے عوام کے حقوق کو پامال کرنے میں کس حد تک جری اور بیباک تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سرپھرے اور مفلوج آمر نے نشۂ اقتدار میں بدمست ہو کر ۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی پوری کابینہ اور اس کے آئینی سربراہ کو برطرف کر دیا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں فیڈرل کورٹ کے حکم کے مطابق جب دستور ساز اسمبلی ازسرِنو معرضِ وجود میں آئی تو اس نے ۱۹۵۶ء میں ایک ایسا دستور تیار کیا جس کو قوم نے چند ترامیم کے ساتھ ملی آرزوؤں کا کسی حد تک ترجمان سمجھتے ہوئے

قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کے مطابق انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں لیکن عین اُس وقت جب قوم انتخابی سرگرمیوں میں مصروف تھی ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ کر کے اسے کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ملک پر چار سال تو مارشل لا مسلط رہا بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں ایک دستور جس میں قوم کی رائے کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا ملک میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ نافذ ہوا۔ اس دستور کا مقصد صرف یہ تھا کہ سربراہ مملکت کو مارشل لا کی رُو سے جو وسیع اختیارات حاصل تھے انہیں آئینی جواز فراہم کر دیا جائے مگر عوام نے اسے بھی یہ سوچ کر گوارا کر لیا کہ چلیے اس کے نفاذ سے مارشل لا تو ختم ہو جائے گا اور وہ دنیا کے سامنے یہ کہنے کے قابل ہو جائیں گے کہ ان کے ہاں ایک دستوری اور آئینی حکومت قائم ہے۔

اس دستور کے نفاذ کے بعد عوام کے اندر یہ ولولہ بیدار ہوا کہ وہ اپنے چھنے ہوئے حقوق کی بازیابی کے لیے جدوجہد کریں اور برسرِ اقتدار طبقے کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دستور کے اندر ایسی ترمیمات کر دے جن سے ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب بڑی مشکل سے اس بات کے لیے تیار ہوئے تھے کہ ۱۹۶۹ء میں پھر ملک مارشل لا کے شکنجے میں آگیا اور اسی انتشار اور افراتفری کے عالم میں ہمیں نصف ملک سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دلفگار المیہ کے پیچھے بیرونی ہاتھ بھی تھے مگر اس حقیقت کو آخر کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں دستوری خلا ہونے کی وجہ سے عوام کے اندر یہ تاثر پوری طرح پھیل چکا تھا کہ اس ملک میں انسان تو صرف چند اصحابِ اقتدار ہی ہیں۔ ان مقتدر ہستیوں کے علاوہ جو لوگ بھی اس سرزمین میں آباد ہیں اُن کے کوئی حقوق نہیں۔ اُن کی زندگی کا مقصد محض آقاؤں کی خدمت اور چاکری ہے۔ اس احساس ہی نے ان کے اندر یاس و قنوطیت اور نفرت کو جنم دیا جن سے بالآخر ملک دولخت ہو گیا۔

اس خوفناک تباہی کے بعد ملک میں ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جس کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اُسے عوام نے اپنے ووٹوں سے منتخب کیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس حکومت کے سربراہ وہ شخص بنے جن کے آمرانہ عزائم کسی سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک آئینی سربراہ کی حیثیت سے حلف اُٹھانے کے بجائے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حلف اُٹھانا پسند کیا اور مارشل لا کو ایک خاص مدت تک نافذ رکھنے پر سخت اصرار کرتے رہے۔ زخموں سے چُور اور خستہ حال قوم نے دل پر پتھر رکھ کر اُن کے

اس صریح ناجائز مطالبے کو مان لیا کیونکہ اُسے یہ ڈر تھا کہ اُن پُر آشوب حالات میں اختلاف کی چنگاریاں کہیں پاکستان کے مغربی حصے کو بھی جلا کر خاکستر نہ کر دیں۔ مارشل لا سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھٹو صاحب نے جس طرح کی آمرانہ کارروائیاں روا رکھیں ان سے پوری دنیا واقف ہے۔ جمہوریت کے "یہ دعویدار" اس بات کے لیے برابر کوشاں رہے کہ اس ملک میں عرصہ دراز تک جمہوریت کی تذلیل ہوتی رہے لیکن عوام کے دباؤ کی وجہ سے جب وہ جنگل کے اس قانون کو خیرباد کہہ کر ایک دستور کے تحت حکومت کرنے پر یکسر مجبور ہو گئے تو انہوں نے ایک ایسا دستور تیار کیا جس میں برسراقتدار طبقے کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ اس دستور میں جس قسم کی ناانصافیوں کو تحفظ دیا گیا وہ سب پر عیاں تھیں اور ہر سوچنے سمجھنے والا شخص اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ یہ دستور ایک مسلم قوم کی امنگوں کا ترجمان نہیں ہے لیکن حزبِ اختلاف نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اسے محض اس بنا پر قبول کر لیا کہ کسی طرح اس بدنصیب قوم کو مارشل لا کی لعنت سے تو چھٹکارا حاصل ہو۔ حزب اختلاف کی دستور کے بارے میں جو رائے تھی وہ تو سب کے سامنے ہی ہے لیکن برسراقتدار طبقے نے اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ چشمِ فلک نے آج تک اس سے زیادہ بہتر، اس سے زیادہ جمہوری اس سے زیادہ اسلامی مزاج کا حامل اور اس سے زیادہ جامع و مانع کوئی دوسرا دستور نہیں دیکھا لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جس طبقے نے اتنے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس دستور کو نافذ کیا تھا اُس نے ڈیڑھ سال کی مدت گذرنے سے پہلے ہی بنیادی مسائل تک میں ترمیم کرنا شروع کر دی۔ حکمران طبقہ اکثریت کے بل بوتے پر جس طرح چاہتا ہے دستور کا حلیہ بگاڑتا چلا جاتا ہے لیکن طاقت کے زعم میں وہ غالباً اس حقیقت کو بھول رہا ہے کہ اُس کی اِس دیدہ دلیری سے ان امور میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے جن میں تھوڑی مدت پیشتر اتفاق رائے ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انتشار کے جس دیو کو قوم نے بڑی مشکل سے پابند سلاسل کیا تھا برسراقتدار طبقہ خود اس کی زنجیریں کھول کر اُسے تباہی مچانے کے لیے آزاد چھوڑ رہا ہے۔

اگر اربابِ حکومت ہی دستور کے تقدس کو پامال کرنے لگیں تو عوام کی نظروں میں اس کا احترام کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟ کیا دستور کے معاملے میں ان کی اس غیر سنجیدہ روش سے عوام کے اندر یہ احساس پیدا نہ ہو گا کہ حکمران طبقے کی خواہشات کا نام ہی دستور ہے جو ان کے بدلتے ہوئے مصالح کے ساتھ ساتھ خود بخود تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ احساس بڑھتا گیا تو کیا بقول رد سو دستور کے متعلق عوام یہ سمجھنے پر مجبور نہ ہوں گے

کہ جس ضابطہ کو یہاں دستور کہا جاتا ہے اس کی حیثیت تو مکڑی کے جالے کی سی ہے جو صرف کمزوروں اور ناتوانوں کو پھانسنے کے لیے بُنا گیا ہے ورنہ جہاں تک اصحابِ اقتدار کا تعلق ہے وہ اسے جس وقت چاہتے ہیں توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور کوئی اُن سے باز پرس کرنے والا نہیں ہوتا۔ بنیادی اُمور میں حالیہ دستوری ترمیم جن مقاصد کے تحت اور جس جلد بازی اور تیزی سے کی گئی ہیں ان سے عوام کے خدشات میں بہت حد تک اضافہ ہوا ہے اور ارباب اختیار کی بار بار یقین دہانیوں کے باوجود کہ وہ ملک میں یک جماعتی حکومت نافذ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، اسلام اور جمہوریت کا مستقبل بڑا تاریک پاتے ہیں۔ اگر آپ ان ترامیم پر نگاہ ڈالیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں بڑی تیزی کے ساتھ جمہوریت کا گلا گھونٹ کر آمریت کی راہ ہموار کی جارہی ہے۔

آئین میں شہری آزادیوں کے سلسلے میں عوام کو یہ تحفظ دیا گیا تھا کہ کسی شخص کو ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار کرنے کی صورت میں ایک ماہ بعد لازمی طور پر جائزہ بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اب یہ میعاد ایک ماہ سے بڑھا کر تین ماہ کر دی گئی ہے یعنی حکومت ایک شخص کی آزادی بغیر کوئی وجہ بتائے تین ماہ تک بڑی بے تکلفی کے ساتھ سلب کر سکتی ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ایک ترمیم کے ذریعے حکومت کو اس امر کا بھی اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی شخص کے بارے میں یہ محسوس کرے کہ اس کا وجود ملک کی سلامتی، استحکام اور خود مختاری کے لیے خطرہ ہے یا وہ کسی ایسی جماعت کا رکن ہے جو قوم دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے تو اس کا معاملہ سرے سے جائزہ بورڈ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت جس شخص کو چاہے نہ صرف گرفتار کر سکتی ہے بلکہ اسے اپنی مرضی کے مطابق غیر معینہ مدت تک جیل میں بھی ڈال سکتی ہے اور کوئی اس سے اس امر کی باز پرس نہیں کر سکتا کہ آخر اس پر یہ ظلم کس جرم کی پاداش میں کیا جا رہا ہے۔ اسی ضمن میں دستور کے اندر ایک تبدیلی یہ بھی لائی گئی ہے کہ پہلے حکومت اس بات کی پابند تھی کہ وہ جس شخص کو گرفتار کرے اسے ایک ہفتہ تک اس بات کی اطلاع دی جائے کہ حکومت کی نظروں میں وہ کیوں معتوب ہے۔ اب یہ میعاد ایک ہفتہ سے بڑھا کر پندرہ دن کر دی گئی ہے۔ یعنی حکومت کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ جس شخص کو چاہے دو ہفتہ تک قید و بند میں ڈال دے اور اس پابندِ سلاسل شخص کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے ساتھ یہ ناروا سلوک اس کے کس فعل کی وجہ سے کیا جا رہا ہے۔

(باقی بر صفحہ ۴۲)

فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

(۳)

انکارِ آخرت کے اخلاقی نتائج قرآن کریم میں آخرت کے امکان اور اس کے وجوب پر اتنے مضبوط دلائل قائم کرنے کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ صرف آخرت کا عقیدہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کی سیرت و کردار کو صحیح و مستحکم اخلاقی بنیادوں پر قائم رکھتا ہے۔ یہ نہ ہو تو اس کو ظلم و ستم، فسق و فجور، بدعہدی و خیانت اور بدکاری و بداطواری سے روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کا انکار کرنے والے زبان سے خواہ کتنی ہی حجتیں بگھارتے رہیں، اُن کے عمل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دراصل اخلاقی بے قیدیوں کی آزادی چاہتے ہیں اور اسی کو برقرار رکھنے کے لیے آخرت کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ قرآن مجید میں خود عرب کے معاشرے کی عام طور پر پھیلی ہوئی اخلاقی خرابیوں کی نشان دہی کی گئی اور لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا کہ کیا یہ خرابیاں اُس صورت میں بھی پیدا ہو سکتی تھیں جب لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ ہمیں ایک دن اپنے خدا کے سامنے اپنے ایک ایک فعل کی جواب دہی کرنی ہوگی؟

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۔ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۔ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۔

(القیامۃ ۳ تا ۵)

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔

پہلی دو آیتوں میں اُن لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے

ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرہ ذرہ خاک میں مل کر پراگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں، جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، اُن سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اٹھ کھڑا ہو، جو دس بیس ہزار سال پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پُر زور جواب اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے سوال کی شکل میں دے دیا ہے کہ "کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟" یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمہارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اِسی جسم کے ساتھ جی اُٹھو گے، تو بلاشبہ تمہارا اِس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص، جو خدا کو خالقِ کائنات مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اِس وقت موجود ہو اس کے بے شمار اجزاء کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر اِن اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا؟

پھر فرمایا کہ بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کر کے تمہارا ڈھانچہ پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم حتّٰی کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

آخری فقرے میں منکرینِ آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی کہ اِن لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کر رہی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع یہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ اِن کے اِس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور اِنھیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں، اُسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں یہ اب تک کرتے رہے ہیں، آئندہ بھی اِن کو اس کی کھلی چھوٹ ملی رہے، اور یہ خیال کبھی اِن کو یہ ناروا

آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن اِنہیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اِن اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اس لیے دراصل اِن کی عقل اِنہیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ اِن کی خواہشاتِ نفس اِس میں مانع ہیں۔ اور یہی بات اِن آیات میں فرمائی گئی ہے:

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ۔	اور اُسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔
(المطففین - ۱۲)	
اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ۔	جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ وہ روزِ حساب کو بھول گئے ہیں۔
(ص - ۲۶)	
كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔	ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔
(القیامۃ ۲۰ - ۲۱)	

یہ منکرین کے انکارِ آخرت کی دوسری وجہ ہے۔ پہلی وجہ تو اوپر بیان کر دی گئی کہ وہ فجور کی کھلی چھوٹ چاہتے ہیں اور ان اخلاقی پابندیوں سے بچنا چاہتے ہیں جو آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر عائد ہوتی ہیں، اس لیے دراصل خواہشاتِ نفس انہیں انکارِ آخرت پر اُبھارتی ہیں اور پھر وہ عقلی دلیلیں بگھارتے ہیں تاکہ اپنے اِس انکار کو معقول ثابت کریں۔ اب دوسری وجہ یہ بیان کی جا رہی ہے کہ منکرینِ آخرت چونکہ تنگ نظر اور کوتاہ بین ہیں اس لیے اُن کی نگاہ میں ساری اہمیت اُنہی نتائج کی ہے جو اِسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں اور اُن نتائج کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے جو آخرت میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو فائدہ یا لذت یا خوشی یہاں حاصل ہو جائے اُسی کی طلب میں ساری محنتیں اور کوششیں کھپا دینی چاہییں کیونکہ اسے پا لیا تو گویا سب کچھ پا لیا، خواہ آخرت میں اس کا انجام کتنا ہی بُرا ہو۔ اِسی طرح اُن کا خیال یہ ہے کہ جو نقصان یا تکلیف یا رنج و غم یہاں پہنچ جائے وہی دراصل بچنے کے قابل چیز ہے، قطع نظر اِس سے کہ اس کو برداشت کر لینے کا کتنا ہی بڑا اجر آخرت میں مل سکتا ہو۔ وہ نقد سودا چاہتے ہیں۔ آخرت جیسی مُعد کی چیز کے لیے

وہ نہ آج کے کسی نفع کو چھوڑ سکتے ہیں نہ کسی نقصان کو گوارا کر سکتے ہیں۔ اِس اندازِ فکر کے ساتھ جب وہ آخرت کے مسئلے پر عقلی بحثیں کرتے ہیں تو دراصل وہ خالص عقلیت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے یہ اندازِ فکر کام کر رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کا فیصلہ بہر حال یہی ہوتا ہے کہ آخرت کو نہیں ماننا ہے خواہ اندر سے اُن کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ آخرت کے امکان و وقوع اور وجوب کی جو دلیلیں قرآن میں دی گئی ہیں وہ نہایت معقول ہیں اور اس کے خلاف جو استدلال وہ کر رہے ہیں وہ نہایت بودا ہے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ـ (الدّھر - ۲۷)	یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دُنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اُسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یعنی یہ کفارِ قریش جس وجہ سے اخلاق اور عقائد کی گمراہیوں پر مصر ہیں، اور جس بنا پر اللہ کے رسول کی دعوتِ حق کے لیے اِن کے کان بہرے ہو گئے ہیں، وہ دراصل اِن کی دُنیا پرستی اور آخرت سے بے فکری و بے نیازی ہے۔ اس لیے ایک سچے خدا پرست انسان کا راستہ اِن کے راستے سے اِتنا الگ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی مصالحت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۔ (التکاثر - ۱ تا ۸)	تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ (اِسی فکر میں) تم لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سُن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھو گے۔ پھر ضرور اُس روز تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔

لفظ اَلْهٰكُمْ لَهْو سے ہے جس کے اصل معنی غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ اُس شغل کے

لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں منہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اس مادّے سے جب اَلْھٰکُمْ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی لَہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمہیں کسی اور چیز کا، جو اُس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اُسی کی دُھن تم پر سوار ہے۔ اُسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اس انہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

تکاثُر کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسری یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔

پس اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے معنی ہوئے تَکاثُر نے تمہیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اُس کی دُھن نے تمہیں اُس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔ اس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثُر میں کس چیز کی کثرت اور اَلْھٰکُمْ میں کس چیز سے غافل ہو جانا مراد ہے، اور اَلْھٰکُمْ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مُخاطب کون لوگ ہیں۔ اس عدمِ تصریح کی وجہ سے ان الفاظ کا اطلاق اپنے وسیع ترین مفہوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثُر کے معنی محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذّت، اور وسائلِ قوت و اقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جہد کرنا، اُن کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ان کی کثرت پر فخر جتانا اُس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اَلْھٰکُمْ کے مخاطَب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اُس کے مخاطَب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اُس پر فخر جتانے کی دُھن افراد پر بھی سوار ہے اور اقوام پر بھی۔ اسی طرح اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ میں چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثُر نے لوگوں کو اپنے اندر مُنہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اس لیے اس کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اس تکاثُر کی دُھن نے ہر اُس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں۔ عاقبت سے غافل ہو گئے۔ اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ انہیں بس معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دولت

چاہیے، اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اُنہیں عیش و عشرت اور جسمانی لذتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اِس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اِس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اِس روش کا انجام کیا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ سے زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے، اور اس معاملہ میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اِس بات کی فکر اُنہیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سر و سامان ہے۔ غرض تکاثُر کی بے شمار صورتیں ہیں جنھوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ انہیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ اور یہ فکر مرتے دم تک اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

اس غلطی پر انسانوں کو متنبہ کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ تمھیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاعِ دُنیا کی یہ کثرت، اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے عنقریب اس کا بُرا انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا اور تم جان لو گے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔ عنقریب سے مُراد آخرت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس ہستی کی نگاہ ازل سے ابد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے، اس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ لیکن اس سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ تو کسی انسان سے بھی کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ اور یہ بات مرتے ہی انسان پر کُھل جائے گی کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھپا کر آیا ہے وہ اس کے لیے سعادت و خوش بختی کا ذریعہ تھے یا بدانجامی و بدبختی کا ذریعہ؟

پھر قرآن خود عربی معاشرے میں سے چند سامنے کی مثالیں دے کر بتاتا ہے کہ آخرت سے غفلت نے لوگوں میں کیسی کیسی بُرائیاں پیدا کر دی ہیں۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ	تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے۔ جن
اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ	کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا
يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ	پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○	دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ
اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ	لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اُٹھا

مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (المطففین ۱ تا ۶)

کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جبکہ سب لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

لفظ مُطَفِّفِيْن طَفِيف سے مشتق ہے جس کے معنی عربی زبان میں چھوٹی اور حقیر چیز کے ہیں، اور تَطْفِيف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے تھوڑی تھوڑی کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اُڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا اُڑاتا رہتا ہے اور خریدار بیچارے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ تاجر اُسے کیا اور کتنا گھاٹا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بُرائی جو معاشرے میں عام تھی، کبھی نہ پھیل سکتی اگر لوگوں کو آخرت کا کوئی خیال ہوتا۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر ۱۷ تا ۲۰)

ہرگز نہیں (دنیوی خوشحالی یا بدحالی معیارِ عزّت و ذلّت نہیں ہے) بلکہ تم یتیم سے عزّت کا سلوک نہیں کرتے، اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو۔

یعنی تم نے دنیوی خوشحالی و بدحالی کو جو معیارِ عزت و ذلت سمجھ رکھا ہے یہ تمہارا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے۔ ورنہ اصل معیار تو اخلاق کی خوبی و زشتی ہے۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ یتیم کا باپ جب تک زندہ رہتا ہے اس کے ساتھ تمہارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے اور جب اس کا باپ مر جاتا ہے تو ہمسائے اور دُور کے رشتہ دار تو درکنار چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ تمہارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک دوسرے کو اس کا انتظام کرنے پر اُکسائیں۔ میراث میں عورتوں اور بچوں کو تو تم نے ویسے ہی محروم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا ہے وہ بلا تامل ساری

میراث سمیٹ لیتا ہے۔ اور ان سب کا حصہ مار کھاتا ہے جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیت تمہاری نگاہ میں نہیں ہے کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دو خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ مال کمانے میں جائز و ناجائز اور حلال وحرام کی تمہیں کوئی فکر نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جا سکتا ہو اسے حاصل کرنے میں تمہیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے تمہاری حرص وطمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ	کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و
بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي	سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے
يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ	دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں
طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ (الماعون ۱تا۳)	اکساتا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے دو نمایاں ترین مثالیں دے کر دراصل یہ بتایا ہے کہ انکارِ آخرت لوگوں میں کس قسم کی اخلاقی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ اصل مقصود اِن دو ہی باتوں پر گرفت کرنا نہیں ہے کہ آخرت کو نہ ماننے سے بس یہ دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ یتیموں کو دھتکارتے ہیں اور مسکینوں کا کھانا دینے پر نہیں اکساتے۔ بلکہ جو بے شمار خرابیاں اس گمراہی کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں ان میں سے دو ایسی چیزیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن کو ہر شریف الطبع اور سلیم الفطرت انسان مانے گا کہ وہ نہایت قبیح اخلاقی رذائل ہیں۔ اس سے یہ بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ اگر یہی شخص خدا کے حضور اپنی حاضری اور جواب دہی کا قائل ہوتا تو اس سے ایسی کمینہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں کہ یتیم کا حق مارے، اس پر ظلم ڈھائے، اس کو دھتکارے، اور مسکین کو نہ خود کھلائے نہ کسی سے یہ کہے کہ اس کا کھانا اس کو دو۔ آخرت کا یقین رکھنے والوں کے اوصاف تو وہ ہیں جو سورۂ عصر اور سورۂ بلد میں بیان کیے گئے ہیں کہ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (وہ ایک دوسرے کو خلقِ خدا پر رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں) اور وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (وہ ایک دوسرے کو حق پرستی اور ادائے حقوق کی نصیحت کرتے ہیں)۔

دنیا میں انسان امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے

ایک طرف قرآن نے اِس طریقے سے آخرت کے امکان اور اس کی ضرورت کے متعلق لوگوں کے ہر شبہ کو نہایت معقول طریقہ سے رفع کیا اور دوسری طرف اس نے ان کو یہ بھی بتایا کہ تم اپنی غفلت کی وجہ سے دنیا کو محض ایک چراگاہ یا تفریح گاہ سمجھے بیٹھے ہو، حالانکہ یہ ایک

امتحان گاہ ہے جہاں ہر وقت اپنی زندگی کے ہر انفرادی اور اجتماعی معاملہ میں تم دراصل امتحان دے رہے ہو۔ اور یہ امتحان تمہیں بے خبر رکھ کر نہیں لیا جا رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ بتانے کا پورا انتظام کر دیا ہے کہ اس میں تمہاری کامیابی و ناکامی کا مدار کس چیز پر ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ	جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم
لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا	لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے
(الملک - ۲)	والا ہے۔

یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے شروع کیا ہے کہ اُن کا امتحان لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اول یہ کہ موت اور حیات اُسی کی طرف سے ہے۔ کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اُس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اُسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اُس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا بُرائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے کہ وہ کیسا انسان ہے۔ چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والے کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ لہٰذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اُسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ممتحن کے نزدیک حُسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہوگا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی، کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ	ہم نے انسان کو ایک مخلوط نُطفے سے
اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ	پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اسی غرض
سَمِیْعًا بَصِیْرًا ۝ اِنَّا هَدَیْنٰهُ	کے لیے ہم نے اسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔
السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا	ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا

کَفُوْرًا (الدھر ۲-۳) بننے یا کفر کرنے والا۔

یہ ہے دنیا میں انسان، اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حیثیت۔ وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں پورا ہو جائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حصے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔ نیز یہ دنیا اُس کے لیے نہ دارالعذاب ہے، جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دارالجزا ہے، جیسا کہ تناسخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں، اور نہ رزم گاہ، جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اُس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ وہ جس چیز کو عمر سمجھتا ہے حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اُسے یہاں دیا گیا ہے۔ دنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اس کو تصرف کے مواقع دیے گئے ہیں، جن حیثیتوں میں بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے اور جو تعلقات بھی اُس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں، وہ سب اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اِس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اِس کا دنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اُس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔ اور اُس کی کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اِس پر ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہوئے یہاں کام کیا اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیے جو اسے یہاں دیے گئے تھے۔ اگر اُس نے اپنے آپ کو بے خدا یا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا، اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جواب دہی نہیں کرنی ہے، تو اُس کا سارا کارنامۂ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اُس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور آخرت کی جواب دہی کو پیشِ نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ (یہ مضمون قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اُن سب مقامات کا حوالہ دینا یہاں مشکل ہے۔ جو حضرات اسے پوری طرح سمجھنا چاہتے ہوں وہ تفہیم القرآن کی ہر جلد کے آخر میں فہرست موضوعات کے اندر لفظ "آزمائش" نکال کر وہ تمام مقامات دیکھ لیں جہاں قرآن میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں یہ حقیقت اِتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہو)۔

پھر فرمایا گیا "ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا"۔ اس کا مفہوم صحیح طور پر "ہوش گوش رکھنے والا بنایا" سے ادا ہوتا ہے، لیکن ہم نے ترجمے کی رعایت سے سمیع کے معنی "سُننے والا" اور بصیر کے معنی "دیکھنے والا" کیے ہیں۔

اگرچہ عربی زبان کے اِن الفاظ کا ترجمہ یہی ہے مگر ہر عربی دان جانتا ہے کہ حیوان کے لیے سمیع اور بصیر کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ بھی سُننے اور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پس سُننے اور دیکھنے سے مُراد یہاں سماعت اور بینائی کی وہ قوتیں نہیں ہیں جو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذرائع علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں اس لیے اختصار کے طور پر صرف انہی کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیے گئے ہیں وہ اپنی نوعیت میں اُن حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیے گئے ہیں کیونکہ اُس کے ہر حاسّے کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعے سے آنے والی معلومات کو جمع کرکے اور ان کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج نکالتا ہے، رائے قائم کرتا ہے اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رویۂ زندگی مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کے بعد کہ انسان کو پیدا کرکے ہم اس کا امتحان لینا چاہتے تھے یہ ارشاد فرمانا کہ اسی غرض کے لیے ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے علم اور عقل کی طاقتیں دیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام یہ نہ ہو اور سمیع و بصیر بنانے کا مطلب محض سماعت و بینائی کی قوتیں رکھنے والا بنانا ہی ہو تو ایک اندھا اور بہرا آدمی تو پھر امتحان سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی علم و عقل سے بالکل محروم نہ ہو، امتحان سے اس کے مستثنیٰ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے اسے محض علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شکر کا راستہ کون سا ہے اور کفر کا راستہ کونسا، اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ سُورۂ بَلَد میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ "وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" اور ہم نے اسے دونوں راستے (یعنی خیر و شر کے راستے) نمایاں کرکے بتا دیے"۔ اور سورۂ شمس میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا "اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) اُستوار کیا، پھر اُس کا فجور اور اس کا تقویٰ دونوں اس پر الہام کر دیے"۔ ان تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے، اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے اُن تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں بتایا

گیا ہے کہ اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے دنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں "راستہ دکھانے" سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی حس بھی دی گئی ہے جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے، بعض افعال اور اوصاف کو برا جانتا ہے اگرچہ وہ خود ان میں مبتلا ہو، اور بعض افعال و اوصاف کو اچھا جانتا ہے اگرچہ وہ خود ان سے اجتناب کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اپنی اغراض و خواہشات کی خاطر ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جن کی بنا پر بہت سی برائیوں کو انھوں نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، ان کا حال بھی یہ ہے کہ وہی برائیاں اگر کوئی دوسرا ان کے ساتھ کرے تو وہ اس پر چیخ اٹھتے ہیں اور اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے جھوٹے فلسفوں کے باوجود حقیقت میں وہ ان کو برا ہی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح نیک اعمال و اوصاف کو خواہ کسی نے جہالت اور حماقت اور دقیانوسیت ہی قرار دے رکھا ہو، لیکن جب کسی انسان سے خود اس کی ذات کو کسی نیک سلوک کا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی فطرت اسے قابلِ قدر سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

۲۔ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو اسے ہر اس موقع پر ٹوکتی ہے جب وہ کوئی برائی کرنے والا ہو یا کر رہا ہو یا کر چکا ہو۔ اس ضمیر کو انسان خواہ کتنی ہی تھپکیاں دے کر سلائے، اور اس کو بے حس بنانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لے، لیکن وہ اسے بالکل فنا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ دنیا میں ڈھیٹ بن کر وہ اپنے آپ کو قطعی بے ضمیر ثابت کر سکتا ہے۔ وہ حجتیں بگھار کر دنیا کو دھوکا دینے کی بھی ہر کوشش کر سکتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو بھی فریب دینے کے لیے اپنے افعال کے بے شمار عذرات تراش سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اللہ نے اس کی فطرت میں جو محاسب بٹھا رکھا ہے وہ اتنا جاندار ہے کہ کسی برے انسان سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ قیامہ میں فرمائی گئی ہے کہ "انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے" (آیت ۱۵)۔

۳۔ انسان کے اپنے وجود میں اور اس کے گرد و پیش زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہو سکتا، نہ بہت سے

خدا اس کارخانۂ ہستی کے بنانے اور چلانے والے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح آفاق اور اَنفُس کی یہی نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کر رہی ہیں۔ انسان اگر ان سے آنکھیں بند کر لے، یا اپنی عقل سے کام لے کر ان پر غور نہ کرے، یا جن حقائق کی نشان دہی یہ کر رہی ہیں اُن کو تسلیم کرنے سے جی چُرائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی خبر دینے والے نشانات اس کے سامنے رکھ دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔

۴۔ انسان کی اپنی زندگی میں، اُس کی ہم عصر دنیا میں، اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجربات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالاتر حکومت اُس پر اور ساری کائنات پر فرماں روائی کر رہی ہے، جس کے آگے وہ بالکل بے بس ہے، جس کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔ یہ تجربات و مشاہدات صرف خارج ہی میں اس حقیقت کی خبر دینے والے نہیں ہیں، بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اُس بالاتر حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے جس کی بنا پر بڑے سے بڑا دہریہ بھی بُرا وقت آنے پر خدا کے آگے دُعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مشرک بھی سارے جھوٹوں خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

۵۔ انسان کی عقل اور اُس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ جرم کی سزا اور عمدہ خدمات کا صلہ ملنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے اور جن خدمات کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے ان کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اخلاق اور قانونِ مکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب اگر یہ مسلّم ہے کہ اس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پوری سزا تو درکنار سرے سے کوئی سزا ہی نہیں دی جا سکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پورا صلہ تو کیا، کوئی صلہ بھی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ کوئی بے وقوف یہ فرض کرے، یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصور رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب اُس کے ذمّے رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کے اندر یہ انصاف کا تصور آخر آ کہاں سے گیا؟

۶۔ اِن تمام ذرائع رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی صریح اور واضح رہنمائی کے لیے دنیا میں انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل کیں جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شکر کی راہ کونسی ہے اور کفر کی راہ کونسی اور ان دونوں راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں۔ انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات، بے شمار محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہیں کہ کوئی انسانی آبادی بھی خدا کے تصور، آخرت کے تصور، نیکی اور بدی کے فرق، اور اُن کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ علم اُسے انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی سے حاصل ہوا ہے۔ آج جو لوگ انبیاء اور کتابوں کے منکر ہیں، یا اُن سے بالکل بے خبر ہیں، وہ بھی اُن بہت سی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو دراصل اُنہی پیغمبروں اور کتابوں کی تعلیمات سے چھَن چھَن کر اُن تک پہنچی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ ان چیزوں کا اصل ماخذ کونسا ہے۔

فیصلے کا ایک دن مقرر ہے

اس کے بعد قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا کہ اس امتحان کا نتیجہ اسی دنیا میں ظاہر نہ ہوگا، بلکہ ایک وقت اس کے لیے مقرر ہے جب دنیا کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا اور ان سب کا حساب لیا جائے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔

اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (الدخان - ۴۰)	اِن سب کے لیے فیصلے کا ایک طے شدہ وقت ہے۔
قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ (الواقعہ - ۴۹-۵۰)	اِن سے کہو یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر ہے۔
وَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ۔ ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی فَاِذَا ہُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ۔ (الزُّمر - ۶۸)	اور اُس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے اُن کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے (مثلاً فرشتے)۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اُٹھ کر دیکھ رہے ہوں گے۔

وَقِيلَ لِلظّٰلِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ۔ (الزمر۔۲۴)

اور ظالموں سے کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزہ اُس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے۔

اصل میں لفظ "کسب" استعمال ہُوا ہے جس سے مراد قرآن مجید کی اصطلاح میں جزا و سزا کا وہ استحقاق ہے جو آدمی اپنے عمل کے نتیجے میں کماتا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی اصل کمائی یہ ہے کہ وہ اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے۔ اور گمراہی و بدراہی اختیار کرنے والے کی کمائی وہ سزا ہے جو اسے آخرت میں ملنے والی ہے۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ۔ (المومن ۔ ۱۷)

(اُس وقت کہا جائے گا) آج ہر متنفس کو اُس کمائی کا بدلہ دیا جائے گا جو اُس نے (دنیا میں) کی تھی۔ آج کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

یعنی کسی نوعیت کا ظلم بھی نہ ہوگا۔ واضح رہے کہ جزا کے معاملہ میں ظلم کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کسی اجر کا مستحق ہو اور وہ اس کو نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اُس سے کم دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ سزا کا مستحق نہ ہو مگر اسے سزا دے ڈالی جائے۔ چوتھے یہ کہ جو سزا کا مستحق ہو اُسے سزا نہ دی جائے۔ پانچویں یہ کہ جو کم سزا کا مستحق ہو اسے زیادہ سزا دے دی جائے۔ چھٹے یہ کہ مظلوم منہ دیکھتا رہ جائے اور ظالم اس کی آنکھوں کے سامنے صاف بری ہو کر نکل جائے۔ ساتویں یہ کہ ایک کے گناہ میں دوسرا پکڑ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ظلم کی تمام نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا ظلم بھی اس کی عدالت میں نہ ہونے پائے گا۔

انسان جو کچھ دنیا میں کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست واقف ہے

پھر قرآن میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس دارالامتحان میں انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست واقف ہے۔ اس کا کوئی فعل، بلکہ اس کے دل کا کوئی خیال تک اس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس لیے یوم الحساب میں انسان کو اُس خدا سے سابقہ پیش آئے گا جو اس کے پورے کارنامۂ حیات سے پوری طرح باخبر ہے۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (الملک۔۱۳)

تم چھپا کر بات کرو یا زور سے (اُس کے لیے یکساں ہے) وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ

کیا وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور

وَنَجْوٰىهُمْ ۭ بَلٰى ، وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (الزُّخْرُف ۔ ۸۰)	ان کی سرگوشیاں نہیں سن رہے ہیں ؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں ، اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔
وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق ۔ ۱۶)	اُس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔
وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (الحدید ۔ ۴)	وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔
يَعْلَمُ خَاۗىِٕنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۭ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ (المومن ۔ ۱۹ ۔ ۲۰)	اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے۔ اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا۔

(باقی)

تحریک اور جمود

سید اسعد گیلانی

(۴)

شخصی تعلقات کی کمی
تحریک کے اندر جمود داخل ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ قیادت اور کارکنان کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک فاصلہ تو وہ ہوتا ہے جو کام کی کثرت، ہجوم رفقاء کی بہتات، اور تحریکی سرگرمیوں کے اضافے کے سبب سے واقع ہوتا ہے اور قائد تحریک کا فرد فرد سے رابطہ و تعلق و تعارف شناسائی عملاً ممکن نہیں ہوتا۔ یہ صورت تحریک میں نہ جمود پیدا کرتی ہے اور نہ کسی کو کوئی غلط فہمی یا احساس بُعد ہوتا ہے۔ لیکن ایک اور قسم کا فاصلہ شخصی تعلقات کی کمی، قائدینِ تحریک کی مزاجی داخلیت اور انہماکِ ذات کے سبب سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ بند کمروں کی میٹنگیں بڑھ جاتی ہیں اور کھلے میدانوں کے اجتماعات کم ہو جاتے ہیں۔ تب قیادت اور کارکنان میں باہمی بُعد پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ منصوبے کے کام اور تحریکی جدوجہد کا انحصار شخصی اپیل کی بجائے ضابطہ بندی پر منحصر رہ جاتا ہے اور کارکنان اپنے اور قیادت کے درمیان ایک غیر محسوس فاصلہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کے قائدین کے دل اُن سے دُور ہیں۔ ان کے کان ان کی آواز سُننے سے قاصر ہیں۔ ان کی تجاویز بہرے کانوں پر پڑتی ہیں اور ان کے مشورے بلا سماعت مسترد ہو جاتے ہیں۔ تب ان کے اندر نصب العین سے وابستگی اور طریق کار سے اتفاق کے باوجود جذبہ و ولولہ کی وہ ہماہمی نہیں رہ جاتی جو مطلوب ہوتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا رشتہ اپنے قائدین کے ساتھ قلب و روح کا رشتہ نہیں بلکہ ضابطہ و کاغذ کا رشتہ رہ گیا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اب تحریک میں ایثار سے مراد کارکنان کا ایثار ہے۔ قربانی سے مراد کارکنان کی قربانی ہے۔ محنت و جدوجہد سے مراد کارکنان کی محنت و جدوجہد ہے۔ اور پامردی، بہادری، استقامت اور عزیمت سے مراد کارکنان کی پامردی،

بہادری، استقامت اور عزیمت ہے۔ قیادت ان امور سے اپنے آپ کو بالاتر رکھ کر سوچتی ہے۔ ایسی حالت میں کارکنان کے دل بجھنے لگتے ہیں اور یہی بجھتے ہوئے دل جمود کا باعث بن جاتے ہیں۔

راہنمی شخصی تعلقات کا دوسرا رُخ کارکنوں کے دُکھ سُکھ میں شرکت کا عملی مظاہرہ ہے۔ ہر تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد انسان اپنے راستے میں بہت سے موانع پیدا کرلیتا ہے اور اس کی کامیابی سے پہلے پہلے اس کے بہت سے دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اُسے مختلف مواقع پر مشکلات سے دوچار کرتے ہیں۔ نظامِ باطل کا ہر کارندہ اُسے پریشان کرتا ہے۔ پولیس اُسے زچ کرتی ہے۔ محکمہ مال اسے مقدمات میں اُلجھاتا ہے۔ علاقائی چودھری اور سرکاری کارندے اس کا ناطقہ بند کرتے ہیں۔ اور تحریک سے وابستگی کے نتیجے میں اسے ہر ہر قدم پر جہاں بعض سہولتیں ملتی ہیں وہاں بے شمار مزاحمتوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے۔ مقدمات کے اُلجھاؤ، قید و بند، کاروباری مشکلات اور قرض، بیماریاں اور بیکاریاں، یہ سب چیزیں اسے تنہائی میں پریشان کرتی ہیں۔ اگر اس کی وابستگی کسی زندہ اور حساس تحریک سے ہے تو وہ بجا طور پر توقع رکھتا ہے کہ اس کی مشکلات میں اس سے ہمدردی کی جائے گی اور اس کے دُکھ سُکھ میں اس کا ساتھ دیا جائے گا لیکن اگر مشکلات میں اسے کوئی مشورہ بھی دینے کے لیے نہ پہنچے، مدد و رہنمائی تو کیا اس کے ساتھی اسے تنہا ہی چھوڑ دیں کہ وہ خود ہی ہاتھ پاؤں مارتا رہے، مقدمات میں کوئی اس کی پیروی نہ کرے، مشکلات میں کوئی اس کی چارہ گری نہ کرے، حکام سے کشمکش میں کوئی اس کی پشت پر کھڑا نہ ہو، مقامی آویزشوں میں کوئی اس کا دست و بازو نہ بنے، کاروباری تباہی میں کوئی اس کی دست گیری نہ کرے اور نہ پُرسانِ حال ہو تو وہ پورے اجتماع میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کا یہ احساسِ تنہائی ان سب پر اثر انداز ہوتا ہے جو اس کے اِرد گرد جمع ہوتے ہیں اور اس کی بے چارگی دیکھتے ہیں۔ پھر ہر ایک کے دل میں یہی خوف جاگزین ہو جاتا ہے کہ اگر وہ بھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوا تو اس کی دست گیری بھی کوئی نہ کرے گا۔ اس طرح جرأت و شجاعت سے تحریک کی راہ میں آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ کارکنان میں سرد پڑنے لگتا ہے اور یہی سرد مہری آگے بڑھ کر اور اِرد گرد پھیل کر تحریک میں جمود کا عنوان بن جاتی ہے۔

کارکنان کے ساتھ شخصی تعلقات کی کمی کا تیسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کارکن جو حوادثِ زمانہ کے باعث مشکلات و موانعات سے دوچار ہوتے ہیں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ تحریک کی قیادت اور با اثر افراد جس دریا دلی سے غیروں پر نوازشیں کرتے اور ان کی تالیفِ قلب کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اتنی ہی سرد مہری

اپنے مخلص کارکنوں کے ساتھ برتتے ہیں اور گویا تحریک کا ادنیٰ کارکن ہونا ہی عدم توجہی کا باعث ہے اور تحریک سے دُوری ہی توجہ اور التفات کا ذریعہ بن جاتی ہے ۔ یہ نفسیاتی صورتِ حال ممکن ہے کہ کسی تحریک کے قائدین کی اپنے کارکناں کے ساتھ اپنائیت کے سبب پیدا ہو رہی ہو لیکن ایسی اپنائیت جو دُکھ میں مدد نہ دے، سُکھ میں رفاقت نہ کرے اور خشک ضابطہ بندی کا ہی شکار ہو کر رہ جائے، اپنے اندر اپنائیت کی چاشنی اور حلاوت نہیں رکھتی بلکہ دُوری اور غربت کا مزاج اور اثر رکھتی ہے۔

ذاتی محاسبے کی کمی | ایک اخلاقی تحریک کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی صفوں میں اللہ کے حضور جواب دہی کے احساس کی موجودگی ہے ۔ یہ احساس جس درجہ میں موجود ہو اسی درجہ میں معمولی ضوابط بھی موثر ثابت ہوتے ہیں اور جس درجہ میں کُند اور غیر فعال ہو اسی درجہ میں معمولی ضوابط تو کیا تعزیرات و تادیبات بھی غیر مؤثر رہتی ہیں ۔ ایک اسلامی تحریک میں ہر شخص اس شعور کے بعد شامل ہوتا ہے کہ اسے اپنے خدا کی خوشنودی مطلوب ہے اور اسے آخرت میں اپنی ہی کارکردگی اور وفاداری کا اجر و انعام ملتا ہے ۔ اسلام کا عقیدۂ آخرت اور احساسِ جواب دہی انسان کی اصلاح کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے اندر خود اپنا محاسبہ کرنے کا جذبہ و شعور پیدا کرتا ہے ۔ ایک شخص نے حضورؐ سے سوال کیا:

مَا الْاِیْمَان — " ایمان کیا ہے ؟"

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

" اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ "

(جب تجھے اپنی نیکی پر خوشی ہو اور اپنی بُرائی سے تکلیف ہو تو تُو مومن ہے)۔

اس نے پھر عرض کیا، " مَا الْاِثْمُ " (گناہ کیا ہے)

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

" اِذَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ فَدَعْهُ "

(جو کام تیرے دل میں خلش پیدا کرے اسے چھوڑ دے)۔

اگر انسان میں ذاتی محاسبے کا شعور ہو، اس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہو اور اس میں خدا کے سامنے جواب دہی کا خوف موجود ہو تو وہ جان بوجھ کر بالارادہ ایسے رضاکارانہ کام سے، جو اس کے اپنے خدا کا کام ہے اور اس کام کو کرنے سے اس کی بندگی کا فریضہ ادا ہوتا ہے کبھی گریز نہ کرے گا اور نہ اس سے پہلوتہی کرے گا۔

جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں کام کرنے سے پہلو تہی نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ اس کا اپنا کھیت ہے، جس طرح ایک دوکاندار اپنی دکان سے بے پروائی نہیں کر سکتا کہ وہ اس کی اپنی دکان ہے اور اس کا نفع و نقصان کسی دوسرے کا نہیں اس کا اپنا نفع و نقصان ہے، اسی طرح ایک بندۂ مومن خدا کے دین کے کام سے غفلت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کا اپنا کام ہے اور اس کے بدلے میں اسے رضائے الٰہی اور آخرت میں جنت ملنی ہے۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ سے سوال کرے کہ وہ اس تحریک سے کیوں وابستہ ہے؟ یا وہ اپنا تجزیہ خود کرے کہ اس کی مسلمانی محض دماغی مسلمانی ہے یا قلب و روح کی مسلمانی بھی ہے؟ صرف دماغ نے سمجھ لیا ہے کہ یہ کام معقول اور اچھا ہے یا دل نے بھی مان لیا ہے کہ اسی کام پر جان و دل نثار کرنا چاہیے؟

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

بعض اوقات انسان کا دماغ ایک بات کو صحیح تسلیم کر لیتا ہے، اس کے دلائل سے اس کا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے اس کی حقانیت پر ذہنی یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، لیکن دل "میں نہ مانوں" کا وظیفہ پڑھتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ مل کر چلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسی ذہنی مسلمانی فریضۂ بندگی کا کوئی بوجھ نہیں سہ سکتی۔ جب تک انسان کا نفس مطیع نہ ہو، دل نظریے کا عاشق نہ ہو اور اس کی طبیعت اس کے لیے جان کھپانے میں اطمینان و یکسوئی محسوس نہ کرے، اس سے محض خیالی وابستگی بیکار ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی تحریک میں مطمئن اور یکسو کارکنوں کی کثرت ہو۔ ان میں ایسے لوگ کم ہوں جو راستہ بھول کر یا بھٹک کر ادھر آ نکلے ہوں اور ان کی منزل اور منتہائے مقصود کچھ اور ہو۔ کسی دوسری منزل کا مسافر اگر راستہ بھول کر ادھر آ گیا ہو تو وہ جلد یا بدیر ضرور سمت بدل کر اپنی حقیقی منزل کی طرف چلا جائے گا اور اگر اس کی تربیت و اصلاح کا کام مؤثر نہ ہوا تو وہ سمتِ منزل کی طرف سے بددل ہوتا چلا جائے گا جس کے نتیجے میں تحریک کے سامنے آگے بڑھنے کے بجائے تحریک کے اندر تعینِ منزل، سمتِ منزل اور شعورِ منزل کی لامتناہی بحثیں اٹھ کھڑی ہوں گی اور منزل کی طرف سفر کرنے کے بجائے قافلہ انتشارِ ذہنی اور جمود کا شکار ہونے لگے گا۔

نتائجِ جدوجہد میں تاخیر

کسی تحریک میں جمود داخل ہونے کا ایک یہ سبب بھی بن جاتا ہے کہ نتائجِ کار میں تاخیر ہوتی چلی جاتی ہے اور لوگوں پر تکان اور مایوسی غالب آنے لگتی ہے۔ یہ تکان اور مایوسی تحریک کی

صحتِ عامہ کی طرف سے قائدین کی غفلت کے سبب پیدا ہوتی ہے اور اس طرح خاموشی سے تحریک کے اندر پھیلنے لگتی ہے جس طرح ایک بوڑھے آدمی کے جوڑوں میں درد دکھ سختی اور جمود بڑھنے لگتا ہے۔ یہ بھی ایک فطری امر ہوتا ہے اور اس کا تدارک ایک طرف تحریک میں نئے نئے افراد کی کثرت سے شمولیت کے ذریعے ، اور دوسری طرف تاخیرِ نتائج کی عقلی توجیہہ ، اجتماعی محاسبے کے اہتمام اور پروگرام میں مناسب اور ناگزیر تبدیلیوں کے لیے بحث وتمحیص کے اہتمام سے کیا جا سکتا ہے ۔ یہ معاملے کا عملی پہلو ہے کہ کارکنان کے سامنے سارے مسائل رکھے جائیں ۔ انہیں کھلی بحث کا موقع دیا جائے ۔ انہیں اپنے قائدین کے محاسبے کا خصوصی وقت فراہم کیا جائے ۔ ان کے خیال میں جو کوتاہیاں ہو رہی ہوں انہیں بیان کرنے کی ہمت دلائی جائے اور کام کی بہتری کے لیے ان کے مشوروں کا احترام کیا جائے ۔ اس لیے کہ وہ تو قافلے کے رہرو ہیں حقیقی ذمہ داری تو ظاہر ہے کہ قافلہ سالار کی ہی شمار ہوتی ہے ۔ اگر فتح کا سہرا سالار کے گلے میں ڈالا جاتا ہے تو شکست وناکامی کی جوابدہی بھی اسے ہی کرنی چاہیے ۔ اس سے پہلو تہی ممکن نہیں ہے ۔ افراد خاموش رہ سکتے ہیں، تاریخ تو خاموش نہیں رہتی ۔ افراد کو ضابطوں کی پابندی سے خاموش کیا جا سکتا ہے، لیکن تاریخ کا فیصلہ تو سب کو خاموشی سے برداشت کرنا پڑتا ہے ۔

اس کا دوسرا پہلو صبر وحکمت کی کمی بھی ہوتا ہے ۔ تحریک اپنے لاؤ لشکر کہیں سے نہیں لاتی ۔ اسے معاشرے میں سے ہی اپنے مطلب کے آدمی چھانٹنے ہوتے ہیں ۔ معاشرہ ایک وسیع انسانی سمندر کا نام ہے اس میں تحریک کا کارکن سمندر میں کھویا ہوا موتی ہوتا ہے جسے بڑی محنت اور غوآصی سے نکالنا اور اپنے ساتھ شامل کرنا ہوتا ہے ۔ یہ سمندر سے امرت نکالنے کا طویل اور جانگسل کام ہے ۔ سمندر اگر موتیوں سے بھرا ہوا ہو تو یہ تحریک کی خوش بختی ہے ۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو کامیاب کشمکش کے لیے مطلوبہ تعدادِ افراد کی فراہمی ایک طویل عمل ہے ۔ اس طویل عمل کے لیے صبر اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہ صبر اور حکمت کارکنوں میں کم ہی ہوتے ہیں ۔ یہ سکھانے سے ہی آتے ہیں اور یہ کام بھی قیادت کا ہی ہوتا ہے کہ وہ کارکنوں میں صبر وحکمت پیدا کرے ۔ جب ایک طرف نتائج میں تاخیر ہو، دوسری طرف اس کی عقلی توجیہہ موجود نہ ہو، تیسری طرف قیادت کا رابطہ کارکنان سے واجبی سا رہ جائے اور چوتھی طرف کارکنان کو صبر وحکمت کی تعلیم وتربیت کا بھی کوئی مؤثر اہتمام نہ ہو تو اس کے نتیجے میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ جمود ہے ۔

حمیتِ حق میں کمی

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اجتماعی ماحول میں باطل کے نرغے میں رہتے رہتے اور اس کی باطل

اور ظالمانہ تگ و تاز اور کارروائیوں کو انگیز کرتے کرتے تحریک کے اندر حمیتِ حق میں کمی واقع ہوتی چلی جاتی ہے۔ حمیتِ حق اور غیرتِ ایمانی وہ مستقل قیمتی جذبات ہیں جن کی فراوانی سے مومن کے پاس باطل کے خلاف لڑائی کا ایک پورا اسلحہ خانہ تیار رہتا ہے۔ باطل کے وجود کے خلاف ایک چبھتا ہوا احساس، اس کی ناروا کارگزاریوں کے خلاف جذبات کا بھڑکتا ہوا شعلہ، اس کے ظلم و تشدد پہ شدید ردعمل، اس کی موجودگی کا غصہ اور اسلامی نظامِ حیات کی غیر موجودگی کا غم، غرض مومن کے ضمیر میں باطل کے خلاف ایک ہر وقت اُبلنے والا لاوا موجود رہتا ہے جس کی موجودگی سے ہی مومن باطل کے خلاف کشمکش میں شعلۂ جوالہ کی مانند گرم و آتش زیر پا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلبۂ باطل کے تسلسل کے سبب جذباتِ مزاحمت میں اضمحلال آنے لگتا ہے۔ جن چیزوں پر کبھی احتجاج کیا ہوتا ہے ان سے بدتر امور کے وارد ہو جانے پہ پہلی چیزوں کو برداشت کرنے کے نتیجے میں جذباتِ مزاحمت و احتجاج کے اندر زوال پیدا ہو جاتا ہے اور بالآخر باطل کی پیش قدمیوں کے مقابلے میں تحریک کے مسلسل برداشت اور چشم پوشی کے رویے سے تحریک کے اندر چھوٹی برائیوں کی طرف سے مداہنت کی فضا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر چھوٹی بُرائی ایک بڑی بُرائی کے مقابلے میں رکھ کر برداشت کر لی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ باطل اپنی حکمتِ کار سے ہر بُرائی کو بتدریج چھوٹی بُرائی بناتا ہے اور اس سے بڑی بُرائی کو میدان میں اُتارتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جن بُرائیوں کو کبھی بڑی بُرائی قرار دے کر ان کے خلاف احتجاج کیا اور کسی چھوٹی بُرائی کو برداشت کیا تھا وہی بُرائیاں چھوٹی ہو کر قابلِ برداشت شمار کر لی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ پھر ان سے بڑی بُرائیاں میدان میں آتی چلی جاتی ہیں۔ اس طرح بُرائیوں کو برداشت کرنے کا ماحول بتدریج حمیتِ حق میں کمی کرتا اور مومن کے اندر شعلۂ ایمان کو ضعیف سے ضعیف تر کرتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ ضعفِ جذبۂ ایمانی درحقیقت تحریک کے اندر جمود کے بڑھتے چلے جانے کی واضح علامت ہوتا ہے۔

حکمتِ کار میں اختلاف تحریک کے اندر جمود کے اسباب میں ایک نہایت ہی اہم سبب حکمت کار میں اجتماعی اختلاف بھی ہوتا ہے۔ ملک و معاشرے کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی حالات کو پیش نظر رکھ کر ایک طریق کار وضع کیا جاتا ہے، اور تحریک کا نظریہ، نصب العین، پروگرام اور اصولی لائحہ عمل، تحریک کو ایک دوسری نوعیت کے طریق کار کا پابند بناتا ہے۔ تحریک کا مزاج ایک خاص نوعیت کی جدوجہد چاہتا ہے اور تحریک کو چلانے والے لوگ اپنی تدبیر سے اس نوعیت کا اہتمام کرتے ہوئے کام کا ایسا نقشہ وضع کرتے ہیں جو بعض کے نزدیک تحریک کے اصولی طریق کار کے مطابق اور بعض کے نزدیک وہ طریق کار تحریک کے نظریے اور

اُصول کے مخالف و متضاد ہوتا ہے۔ اسی طرح عدمِ اطمینانی کی لہر تحریک کی صفوں میں پھیلتی چلی جاتی ہے۔ بلاشبہ وقتی مصالح بعض تدابیر کو بروئے کار لانے کا تقاضا کرتے ہیں لیکن تدابیر وہی بروئے کار لانا مفید پڑتا ہے جن پر تحریک کی اجتماعی رائے کو اطمینان حاصل ہو۔ اگر عدمِ اطمینان تحریک کی ہر صف، ہر مقام اور ہر نشستِ اجتماع میں مسلسل اور برابر پایا جائے تو اس سے بڑی بے تدبیری کوئی نہیں ہوتی کہ محض اپنی سوچی ہوئی تدبیر کی خاطر تحریک کے اندر اختلاف کی بحثیں چھڑ جائیں اور گھنٹوں کوئی فیصلہ نہ ہو اور برسوں لوگ اس پر مطمئن نہ ہوں وہ تدبیر لازماً ترک کر دینے کے قابل ہوتی ہے۔ ورنہ کسی عارضی تدبیر کو اگر تحریک کے اجتماعی وجود سے بھی بالاتر قرار دے دیا جائے تو اس سے بحث و مناظرے اور اختلاف و انتشار کی وہ فضا پیدا ہوتی ہے جو کسی تحریک کے لیے بھی برکت و رحمت کا باعث نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی تحریک کی قیادت اپنے اندر ایسی فضا کو پرورش پاتے ہوئے محسوس کرے تو اس کی بصیرت اور خدا ترسی، دونوں کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس تدبیر پر تحریک کو قربان نہ کرے اور ایسی تدبیر کو فی الفور ترک کر دے جس نے تحریک کی صفوں میں اختلاف و انتشار کی فضا پیدا کر دی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ حکمتِ کار (STRATEGY) ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ تحریک کی مثال ایک کشتی کی ہوتی ہے جسے صحیح سمت پر رکھنے اور اُسے آگے بڑھانے کا کام اس کی قیادت کرتی ہے۔ لیکن کشتی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ وہ سب مسافروں کی ہوتی ہے جن کی منزل ایک ہے اور جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کے حوالے کر دی ہیں۔ اس کے نفع و نقصان اور سلامتی سے ہر مسافر کو دلچسپی ہوتی ہے اور آدھے مسافروں کو اگر سمتِ منزل میں شبہ لاحق ہو جائے تو کشتی کو اسی رفتار سے آگے نہیں بڑھایا جا سکتا جس رفتار سے اس صورت میں بڑھایا جا سکتا ہے جب سارے مسافر یکسوئی سے کشتی کے صحیح منزل کی طرف جانے کا اطمینان رکھتے ہوں۔ جیسے ہی یہ اطمینان ختم ہوتا ہے اور تحریک کی صفوں میں تحریک کے اجتماعی مفاد کی حفاظت کی بحث چل پڑتی ہے اسی وقت یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ تحریک کی رہنمائی صحیح نہیں ہو رہی ہے اور ضرورت ہے کہ لوگوں کو اپنی تحریک کی سمتِ سفر کے بارے میں اطمینان دلایا جائے۔ اس لیے کہ عدمِ اطمینان کی اس کیفیت کے بڑھتے چلے جانے کا نام جمود ہے جس کی موجودگی میں کوئی تحریک بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی

زندگی کا سرمایہ لگانے سے اجتناب تحریکوں میں جمود کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں شمولیت

اختیار کرنے والے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت تحریک میں زندگی کا سرمایہ لگانے کی بجائے اسے ایک جز وقتی کام سمجھ لیتی ہے۔ انسانی زندگی کا سرمایہ مال و دولت نہیں، بلکہ وقت، محنت اور انسانی صلاحیت ہے۔ اسی سے انسانی زندگی کی قدر و قیمت ہے اور اسی کے لگانے سے دنیا میں تعمیر و تخریب و تغیر کا سارا عمل رونما ہوتا ہے۔ وقت سب سے قیمتی سرمایہ ہے جو جہاں لگا یا جائے وہاں تعمیر وجود میں آتی ہے۔ محنت سب سے بڑا ہتھیار ہے جو جہاں استعمال کیا جائے وہاں میدان فتح ہوتے ہیں۔ صلاحیت سب سے قیمتی حصہ ہے جو کوئی شخص کسی اجتماعی کام میں ڈال کر اسے موثر، بہتر اور کامل بنا سکتا اور اس کے خلا پُر کر سکتا ہے۔

یہ چیزیں لگا کر لوگ اپنے ذاتی کاروبار چمکا لیتے ہیں۔ اپنے معاشرتی معیار قائم کر لیتے ہیں۔ اپنے مالیاتی مستقبل محفوظ کر لیتے ہیں۔ اپنے بچوں اور وارثوں کے لیے اثاثے تعمیر کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ یہ امر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ تحریک خود ایک ملی اجتماعی کاروبار ہے جس کی کامیابی سے ساری ملت بلکہ ساری انسانیت فلاح حاصل کرتی ہے۔ تحریک خود ایک معاشرتی معیار ہے جس کے فروغ سے اس کا مطلوبہ معاشرتی معیار بڑھتا ہے۔ تحریک خود ایک تحفظِ افراد کی مالیاتی ضمانت ہے جو اگر کامیاب ہو تو اس کے بیت المال میں ہر ضرورت مند کا حصہ ہوتا ہے اور جس کی کامیابی کے بعد ضرورت مند بتدریج مستغنی اور دولت مند بنتے چلے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جز وقتی کارگزاریوں سے کبھی کوئی میدان فتح نہیں ہوا اور ریزرو فوجوں سے کبھی کوئی غنیم پسپا نہیں ہوا۔ تحریک کی اصل قوت ایسے افراد ہوتے ہیں جو اپنی انسانی بنیادی ضروریات کا اہتمام کرنے کے بعد اپنی ساری صلاحیتیں، قوتیں، اوقات محنتیں اور سوچ بچار کی قوتیں، سب کچھ اس کام کو آگے بڑھانے پر صرف کریں جو سب کا مشترک کام ہے۔ ان کی اپنی ملت، پوری انسانیت اسلام اور اُن کے اپنے خدا کا کام ہے۔ جس کی کامیابی پر دُنیا و آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اگر کسی تحریک کو ایسے لوگ وافر مل جائیں تو تحریک بڑھتی پھولتی پھیلتی اور فروغ پاتی ہے اور اگر ایسے لوگوں کی کمی ہوتی چلی جائے تو تحریک سمٹتی سکڑتی، مدھم ہوتی اور بجھتی چلی جاتی ہے۔

مخصوص مفادات پر گروہ بندی کا ناسور

تحریکوں کو منجمد کر کے منتشر کر دینے اور پھر انہیں تباہ و برباد اور ہلاک کر دینے کی سب سے بڑی قوت شیطان کی اس تدبیر میں پوشیدہ ہے کہ وہ کسی تحریک کی اجتماعیت میں گروہ بندی پیدا کر دے۔ گروہ بندی ہمیشہ مخصوص مفادات (VESTED INTERESTS)

کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے، اور جب کسی تحریک کی بدبختی اسے اپنا نشانہ بنا لیتی ہے تو وہ مخصوص مفادات کی بنا پر گروہ بندی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ویسے تو اسلامی نظامِ جماعت میں نجویٰ، چغلی غیبت، گروہ بندی جتھہ بندی، جانب داری، ہمہ نوعیت عصبیت، سوئے ظن، بے جا طرفداری، بے وجہ مخالفت، حسد، کینہ، بغض، ریاکاری، بناوٹ جیسی قبیح اخلاقی بیماریوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور یہی بیماریاں آگے بڑھ کر گروہ بندی کا ناسور پیدا کرتی ہیں۔ لیکن اگر کسی اخلاقی انحطاط یا حادثے سے یہ بیماری پیدا ہو ہی جائے تو پھر اسے اس تحریک کے لیے ٹائم بم قرار دیا جا سکتا ہے جو کسی وقت بھی پھٹ کر تحریک اور اس کی اجتماعی ہیئت کے پرخچے اُڑا سکتا ہے۔

مخصوص مفادات کا اشتراک بعض لوگوں میں مشترک جذبات، مشترک رجحانات اور مشترک نقطہ نظر پیدا کر دیتا ہے اور پھر انسان معاملات کو حق اور باطل اور خدا ترسی و خدا ناترسی کے نقطہ نظر سے سوچنے کی بجائے "میری پارٹی اور میرا جتھہ اور میرا مفاد اور میرا آدمی اور میرا راستہ اور میرا وزن" کے اصول پر جانچنے لگتا ہے۔ پھر اس سے کسی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طرزِ عمل کی توقع ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایک فریق ہوتا ہے جو اپنی حیثیت منوانے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ساری حدیں پھاند سکتا ہے، ہر دوسرے کے ساتھ وہ سب کچھ کر سکتا ہے، جو اس کی ضرورت ہو، جو اس کے راستے میں آئے اُسے ہر تدبیر سے نیچا دکھا سکتا ہے، اور اس کا وجود بے رحمی سے ختم کر سکتا ہے۔

ایسی صورتِ حال کا پیدا ہو جانا تحریک کے لیے تباہ کن ہوتا ہے۔ ایک جتھے کے مقابلے میں اگر دوسرا جتھا بنے، تو بات اسی حد تک محدود نہیں رہتی بلکہ جتھہ بندیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور تحریک اپنے مقصد کے لیے کام کرنے کے بجائے آپس کی کشاکش کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ اور اگر تحریک سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد کوئی جوابی جتھے بندی نہ کریں، تو وہ ایک جتھا جو بن گیا ہوتا ہے وہ من مانی کرنے لگتا ہے اور تحریک سے عام کارکنوں کی دلچسپی ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ غرض دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی پیدا ہو، مفادات کی بنا پر جتھہ بندی بہرصورت تحریک کے لیے پیغامِ موت ہوتی ہے۔

عرب کی اوّلین اسلامی تحریک میں جب تک مسلمان ایک امت بن کر کام کرتے رہے، اُنھوں نے سارے جہان کو علم و عمل کی روشنی دی۔ مگر جب اُمت کے اندر جتھہ بندیاں شروع ہوئیں تو اجتماعیت کے اخلاقی، جمہوری اور معاشرتی ادارے زوال پذیر ہوتے چلے گئے اور امت، اور اُس کے توسط سے ساری انسانیت، شریف ترین

حکمرانوں اور بہترین خادمِ خلق حکومت سے محروم ہو گئی ۔ دنیا کی ہر تحریک جو تباہی کی چٹان سے ٹکراتی ہے اگر اس کے ٹکڑے لے کر ان کا تاریخی تجزیہ کیا جائے تو اس میں گروہ بندی کے ٹائم بم کا تباہ کن بارود ضرور ملے گا۔ کسی تحریک کا جو رہنما اپنی تحریک کو اس ہلاکت آفرین بیماری کے پیدا ہونے کے بعد بھی تباہی سے بچا لیتا ہے اس کو اس تحریک کا مسیحا قرار دیا جا سکتا ہے ورنہ گروہ بندی کے بعد تو کسی تحریک کی ہلاکت یقینی ہے ۔

کسی فکری تحریک کا ایک زوردار اُبھار کے بعد پھر جمود کا شکار ہو جانا اور معاشرے کے بیابانِ مرگ میں سکون کی نیند سو جانا کوئی انوکھا معاملہ نہیں ہے ۔ اکثر تحریکوں کو اس مرگِ جمود سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ انہیں اسباب کا شکار ہو جاتی ہیں جن اسباب کو رفع کرنے پر وہ قادر نہیں ہوتیں یا جن کے تدارک کی طرف سے وہ غفلت برتتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی تحریکوں کی تعداد معاشرے میں واقع ہونے والی اصلاحات کے مقابلے میں بالعموم زیادہ ہوتی ہیں ۔ بہت سی تحریکیں سمندر کی پہاڑ جیسی موجوں کی طرح اُٹھتیں اور صحرا کی ریت کی طرح بیٹھ جاتی ہیں ۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ کسی تحریک کے باشعور قائدین ان اسباب جمود سے اپنی تحریک کو بچائیں جو اسباب ہر معاشرے میں اُٹھنے والی فکری انقلابی اور عملی تحریکوں کو جمود کا زنگ لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے ہیں اور بالآخر ان کے ناموں اور کچھ رسمی نام لیوا ہمدردوں کے سوا ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا ۔

نئے کارکنان کی آمد میں کمی

انسانوں پر عمر کا عمل تو لازماً ضعف و اضمحلال بن کر طاری ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہر تحریک جس کی جدوجہد طویل ہو جائے اپنے بہت سے قیمتی اور سرفروش کارکنوں سے بتدریج محروم ہوتی چلی جاتی ہے ۔ کچھ موت کا بازو تھام کر آگے نکل جاتے ہیں اور کچھ عمر کے بوجھ سے مضمحل ہو کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ اس طرح تحریک کی نہایت قیمتی اور آزمودہ قوت گھٹتی چلی جاتی ہے ۔ لیکن اس زائل ہونے والی قوت کی کمی وہ تازہ دم ، فعّال ، چاق چوبند ، جوان سال اور جوش و جذبہ و قوت و توانائی سے معمور کارکن پوری کر دیتے ہیں جو اس تحریک میں تازہ ترین تاثر کے ساتھ نئے داخل ہوتے ہیں جو تحریکی فکر تو اپنے پیش روؤں سے لیتے ہیں اور اپنی قوتِ بازو سے عمل کے میدان میں اس فکر کو کئی گنا آگے بڑھا لے جاتے ہیں ۔

پُرانے تھکے ماندے کارکنوں کا اضمحلال اور نئے تازہ دم کارکنوں کی قوت و چستی بالکل فطری عوامل ہیں ۔ پُرانے کارکنوں نے کبھی نئے لوگوں سے بھی زیادہ کٹھن حالات میں زیادہ بڑی قربانیاں دے کر زیادہ قوت و توانائی اور ایثار و اخلاص سے بہت زیادہ کام کیا ہوتا ہے ۔ ان کی حیثیت خاندان کے اس بزرگ کی سی ہوتی ہے جس نے خاندان کی ایک طویل عرصے تک خدمت کر کے اپنا فرض ادا کر دیا ہوتا ہے ۔ اور اب یہ خاندان کی نئی نسل

کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خاندان کی کفالت کا بوجھ اُٹھائے۔ ہر پُرانی نسل نئی نسل کی طرح اپنے وقت میں اپنا پُرمشقت کام کر چکی ہوتی ہے اور اس کی موجودہ ذمہ داری اب فکری رہنمائی دینا اور تحریک کے مزاج کو پختگی سے اس کے حقیقی مقام پر قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اگر پختہ کار اور بزرگ کارکن نہ ہوں تو تحریک کا اپنے مزاج پر قائم رہنا اور اپنی روایات کو قائم رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان کی موجودگی اور فکری رہنمائی اشد ضروری ہے۔ اور ایسے کسی نسلی خلا (GENERATION GAP) کے بہانے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بزرگ کارکنوں کی حیثیت تحریک میں دماغ کی اور نوجوان کارکنوں کی حیثیت تحریک کے ہاتھ پاؤں کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ تحریک کے جسم کو یہ تازہ دم ہاتھ پاؤں مسلسل میسّر آتے رہیں۔ اگر تحریک نئے کارکنوں سے محروم ہوتی چلی جائے تو اسے ایک نقطۂ انجماد تک پہنچنے اور بالآخر معاشرے میں جذب ہو جانے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

اس لیے تحریک کے ذمہ دار لوگوں کا فرض ہے کہ وہ تحریک میں چاہے جتنا بھی اونچا نظریاتی اور تربیتی معیار رکھیں لیکن ایک خیالی مطلوبہ معیار کے ناپ تول اور اس کے حصول میں اتنی تاخیر اور شدّت بھی نہ کریں کہ اسے صرف عمر رسیدہ لوگ ہی پورا کر سکیں اور اس چھلنی میں سے کئی سالوں کی چھان پھٹک کے بعد جو لوگ تحریک کے معیاری کارکن ثابت ہو کر سامنے آئیں وہ اپنی عمر کا توانائی سے بھرپور حصہ صرف ضمنِ انتظار میں ہی گزار کر مضمحل ہو چکے ہوں اور جب وہ تحریک میں داخل ہوں تو اب ان کے پاس کام نہ کر سکنے کے صرف عذراتِ شرعی ہی باقی رہ گئے ہوں۔

نئے کارکن کیوں نہیں آ رہے ہیں؟ یہ سوال تحریک کے اربابِ حل و عقد کے سامنے ہر دم رہنا ضروری ہے۔ اور انہیں تحریک کی ضرورت اور تناسب کے مطابق نئے کارکن فراہم کر کے آگے لاتے رہنا بھی نہایت ضروری ہے۔ جو تحریک بانجھ ہو کر رہ جائے اور اپنی نئی نسل میں سے اپنے مطلوبہ کارکنوں کی نئی فصل تیار نہ کر سکے اسے موت کے منہ سے کوئی کرامت بھی نہیں بچا سکتی۔

تحریک کے وجود میں تنظیم کی خرابیوں کی روز افزوں افزائش

تحریک کسی تنظیم کے بل پر ہی چل سکتی ہے اور ہر تحریک کا لازمی تقاضا ایک تنظیم ہوتا ہے۔ ایسی تنظیم جو اپنے اعضاء و جوارح میں کَسی ہوئی ہو۔ جس میں کام کا تخمینہ، کام کا جائزہ اور کارکنوں کے اخلاقی معیار اور تحریکی سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جائے۔ جس میں کام لینے والوں کو اپنے ساتھیوں سے کام لینے کا فن آتا ہو۔ وہ ان کی نفسیات سے واقف ہوں اور ان میں حکم

چلانے کی بجائے رضا کاروں سے کام لینے کی حکمت موجود ہو۔ اس لیے کہ تحریکوں میں سب کام رضا کارانہ ہی ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی شخص بھی کسی کا ملازم نہیں ہوتا، اور جو ملازم ہوتا ہے وہ بھی جذبہ و فکر کے اعتبار سے نظریے کے سوا درحقیقت کسی کا بھی ملازم نہیں ہوتا، نہ اپنا ملازم ہونا تسلیم کرتا ہے اور وہ اپنے اندر ملازمانہ ذہن پیدا کر سکتا ہے۔ تحریک کے ناظمین، جو اُوپر سے نیچے تک کام لینے کے ذمہ دار ہوں، اگر وہ خود جانتے ہوں کہ انہیں کیا کام لینا ہے، انہیں کل کام کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنے کا فن آتا ہو، پھر تقسیم کے بعد انہیں حسبِ صلاحیت کارکن لگانے اور انہیں اُکسانے اور کام لینے کی حکمت آتی ہو، اور پھر کام کا محاسبہ کرنے اور کیے ہوئے کام پر حوصلہ افزائی اور نہ کیے ہوئے کام پر مدد، رہنمائی اور برادرانہ اور رفیقانہ تنبیہ کا ڈھنگ آتا ہو، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تحریک فعال و متحرک ہو کر آگے نہ بڑھے۔ ان امور میں جس پہلو پر بھی کوئی خامی ہوگی وہ لامحالہ تحریک کی پیش رفت میں حارج ہوگی۔

کارکنوں میں اِشتغال فی الدنیا کی کثرت دنیا میں رہتے ہوئے اس کے لوازمات اور ضروریات سے صرفِ نظر نہ ممکن ہے اور نہ مطلوب۔ لیکن دنیا ایک پکڑنے والی، گھیرنے والی، اپنے اندر مشغول کرنے والی اور اپنے بے شمار مسائل میں اُلجھانے والی رزمگاہِ خیر و شر ہے۔ اس کے کاموں کے بے شمار اطراف ہیں۔ اس کی ضروریات کے بے شمار شاخسانے ہیں۔ اور اس کے تعلقات کے بے شمار رشتے ناتے اور سمتیں ہیں۔ کسی تحریک کا کارکن اسی دُنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ تحریک بھی اسی دنیا میں چلتی ہے، تحریک کا مقصد بھی اسی دنیا کے بعض امور کو ایک رُخ سے ہٹا کر دوسرے رُخ پر ڈالنا ہوتا ہے، اس لیے ترکِ دنیا کسی انقلابی تحریک کے لیے قطعاً مقصود نہیں ہوتا۔ لیکن تحریک کا مقصد خود اپنے لیے بہت سا وقت طلب کرتا ہے، بہت سی صلاحیتیں مانگتا ہے، بہت سے افراد کی زندگیوں کو اپنے لیے وقف کرنا چاہتا ہے۔ اور ان سے بہت سے دوسرے اشغال چھڑا کر انہیں خالص اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ کسی تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں اگر وہ شعور کے ساتھ وابستہ ہوں تو وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ذمے ایک ایسا کام لیا ہے جو ان سے دوسرے بہت سے کام چھڑا کر ان کی تمام تر توجہات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ تحریکیں بے دلی یا نیم دلی سے نہیں چلائی جا سکتیں اور نہ انہیں اس کیفیت کے ساتھ کامیابی کے کسی کنارے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

ایک اسلامی تحریک اللہ کے دین کو بلند کرنے کا علم لے کر اٹھتی ہے۔ وہ اپنے کارکنوں سے دنیا کے بہت سے زائد از ضرورت کام چھڑا کر انہیں اپنے کام کے لیے وقف کرنا چاہتی ہے۔ جب تک اسلامی تحریک کا مطلوبہ

انقلاب نہ آجائے اس کے کارکنوں کو دنیا داری، دنیا سازی، اور دنیا طلبی کی کوئی مہلت میسّر نہیں ہے اور نہ دنیا ان کے لیے کوئی مطلوب و محبوب شے قرار دی گئی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دین کا کام اعلیٰ اور دنیا کا کام ادنیٰ ہے۔ دین کا کام خدا کا کام ہے اور دنیا کا کام نفس کا کام ہے۔ اور یہ دونوں کام برابر نہیں ہو سکتے۔

قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ	کہہ دو (خدا کی میزان میں) خبیث اور طیب
وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ	برابر نہیں۔ اگرچہ خبیث کی کثرت تم کو کتنا ہی فریفتہ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ ۝	کیوں نہ کرے۔ تو اے اہل بصیرت اللہ سے ڈرتے رہو۔

(مائدہ - ۱۰۰)

لیکن اسلامی تحریک کے کارکن اگر تحریک کے کام کو اپنے روزمرّہ کے کاموں کی فہرست میں اس مقام پہ لے جائیں کہ جب دوسرا کوئی کام نہ ہو تو پھر یہ کام بھی کر لیا جائے، جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ اپنے فارغ اوقات مختلف مشغلوں میں گزارتے ہیں اسی طرح تحریک اسلامی کے لوگ بھی اپنے فارغ اوقات میں سے کچھ حصّہ جو اور کسی کام آنے والا نہ ہو وہ اسلامی تحریک کے کام میں دے دیا کریں تو ایسی فراخ دستی اور فراخ دلی سے کوئی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا، بلکہ تحریک کو جمود کا شکار ہونے سے بھی نہیں بچایا جا سکتا۔ کسی تحریک کو جان بوجھ کر اختیار کرنے والے لوگ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس تحریک میں شریک نہ ہونے والوں کے مقابلے میں اس تحریک کو اپنی ساری قوتیں اور اپنے سارے اوقات دینے کا جذبہ لے کر آگے آتے ہیں۔ اگر وہ بھی انہی لوگوں کی طرح رویہ اختیار کریں جنہوں نے تحریک سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا ہے، تو پھر افسوس ہے کہ وہ تحریک میں آئے اور صد حیف کہ وہ تحریک کے کارکن بھی کہلائیں۔ ایسے لوگوں کے بڑے سے بڑے لشکر بھی تحریک کے لیے کوئی چھوٹے سے چھوٹا مورچہ فتح نہیں کر سکتے۔ (باقی)

رسائل و مسائل

تفہیم القرآن میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کا ترجمہ

سوال:- تفہیم القرآن میں آپ نے الحمد للہ کا ترجمہ "تعریف اللہ کے لیے ہے" کیا ہے۔ حالانکہ مترجمین سلف و خلف نے اس کا ترجمہ "تمام خوبیاں اللہ کے لیے"، "ساری خوبیاں اللہ کے لیے"، "سب تعریف اللہ کے لیے ہے" کیا ہے۔ تفہیم القرآن کا ترجمہ کچھ نامکمل، یا ناتمام سا محسوس ہوتا ہے۔

جواب:- اردو زبان میں "اللہ کے لیے تعریف ہے" اور "تعریف اللہ کے لیے ہے" کے درمیان معنی کے اعتبار سے بہت بڑا فرق ہے۔ اللہ کے لیے تعریف ہے کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ جس طرح دوسروں کے لیے تعریف ہو سکتی ہے اسی طرح اللہ کے لیے بھی ہے۔ لیکن جب "تعریف اللہ کے لیے ہے" کہا جائے گا تو مطلب یہ ہوگا کہ تعریف جس چیز کا نام ہے وہ اپنے تمام مفہومات کے ساتھ اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے، کسی دوسرے کو یہ تعریف نہیں پہنچتی۔ میں نے اس ترجمے میں بعینہٖ اس مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے جو الحمد للہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس اندازِ بیان کو اختیار کرنے سے وہ معنی زیادہ اچھی طرح ادا ہو جاتے ہیں جو دوسرے مترجمین نے "تمام خوبیاں اللہ کے لیے ہیں"، یا ساری خوبیاں اللہ کے لیے ہیں"، یا "سب تعریف اللہ کے لیے ہے"، اور ایسے ہی دوسرے الفاظ سے ادا کرنے چاہے ہیں۔

نماز میں درود

سوال:- "آپ نے "خطبات" میں نماز کی تشریح کرتے ہوئے جو درود درج کیا ہے اس میں سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا کے الفاظ مسنون و ماثور درود سے زائد ہیں۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو درود منقول ہوا ہے اس میں یہ الفاظ نہیں پائے جاتے۔ ایک عالمِ دین نے اس پر

یہ اعتراض کیا ہے کہ مسنون درود سے زائد ان الفاظ کو نماز میں پڑھنا مکروہ ہے۔ آپ کے پاس اس کے لیے کیا سندِ جواز ہے؟

جواب: اِس اضافے کو جو بزرگ مکروہ قرار دیتے ہیں وہ غالباً مسئلے کی نوعیت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تشہد کے پورے مسئلے کی تحقیق کی جائے۔

تشہد کے متعلق صحیح ترین روایت وہ ہے جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے منقول ہوئی ہے۔ اس کو بیس سے زیادہ سندوں کے ساتھ محدثین نے نقل کیا ہے، اور تمام راویوں نے التحیات سے لے کر عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ تک پوری عبارت یکساں نقل کی ہے، کسی روایت کے الفاظ دوسری روایت کے الفاظ سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کر دیا گیا کہ نماز میں صرف یہی تشہد پڑھا جائے۔ امام شافعی ابن عباسؓ کے تشہد کو، اور امام مالک حضرت عمرؓ کے تشہد کو افضل قرار دیتے ہیں، حالانکہ ان کے الفاظ باہم بھی مختلف ہیں اور ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی مختلف۔ ان کے علاوہ تشہد کی بہت سی مختلف عبارتیں حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت علیؓ، حضرت ابوموسیٰؓ اشعری، حضرت عائشہؓ، حضرت سمرہؓ بن جندب، حضرت عبداللہؓ بن زبیر، حضرت ابوحمیدؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت حسینؓ بن علی، حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعیدؓ خدری، اور دوسرے صحابۂ کرام سے احادیث میں روایت ہوئی ہیں۔ ان میں سے جس تشہد کو بھی آدمی پڑھے اس کی نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ ابن عبدالبرؒ اور ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہ مباح میں اختلاف ہے، یعنی ان مختلف تشہدات میں سے کوئی بھی غیر مباح نہیں ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ علماء کی ایک بڑی جماعت ہر اُس تشہد کے پڑھنے کو جائز قرار دیتی ہے جو احادیث سے ثابت ہو۔

لیکن بات صرف یہیں تک نہیں رہتی کہ جو تشہدات حدیث سے ثابت ہیں اُن میں سے کسی ایک کو پڑھ لینا جائز ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک جلیل القدر صحابی حضورؐ سے تشہد کی ایک عبارت خود نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ میں نے اس میں دو جگہ اضافہ کیا ہے۔ یہ حضرت عبداللہؓ بن عمر ہیں۔ ابوداؤد اور دارقطنی میں ان کا یہ ارشاد موجود ہے کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ کے بعد میں نے وَبَرَکَاتُہٗ کا، اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے بعد وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ لَہٗ کا اضافہ کر دیا۔ مگر یہ بات میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمر کے اس فعل کو قابلِ اعتراض ٹھیرایا ہو۔

اب رہا تشہد کے بعد کا مضمون، تو اس کے متعلق سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اس کا پڑھنا سرے سے

لازم ہی نہیں ہے۔ ابوداؤد، مُسند احمد، ترمذی اور دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے عبدہٗ و رسولہٗ تک تشہّد کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا اذا قلت ھٰذا (او قضیت ھٰذا) فقد قضیتَ صلٰوتک، اِن شئتَ ان تقومَ فقم وان شئتَ ان تقعد فاقعد۔ "جب تم نے یہ پڑھ لیا (یا اس کو پورا کرلیا) تو تم اپنی نماز سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد اُٹھ جانا چاہو تو اُٹھ جاؤ، اور بیٹھنا چاہو تو بیٹھے رہو" یہ ارشاد اس باب میں بالکل صریح ہے کہ عبدہٗ و رسولہٗ پر نماز مکمل ہو جاتی ہے، اس کے بعد آدمی کچھ نہ پڑھے تب بھی اس کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، اور درود و دُعا تشہّد میں داخل نہیں ہے بلکہ اس سے زائد ایک چیز ہے۔

اِس زائد چیز کا پڑھنا یقیناً مستحب ہے، لیکن اس کے لیے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی عبارت مخصوص نہیں کی ہے جس کے الفاظ مقرر ہوں اور ان میں کوئی کمی بیشی جائز نہ ہو۔ بخاری و مسلم اور مُسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی جو روایت منقول ہوئی ہے اس میں تشہّد کی عبارت بیان کرنے کے بعد وہ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ثم یتخیّر من المسالۃ ما شاء۔ "پھر آدمی جو دُعا چاہے مانگے"۔ مُسند احمد اور نسائی کی ایک روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ ثم لیتخیّر احدکم من الدعاء اعجبہ الیہ فلیدع بہ ربّہ عزّ وجلّ۔ "پھر تم میں سے ایک شخص کوئی دُعا انتخاب کرلے جو اُسے سب سے زیادہ پسند ہو، اور وہی اپنے ربِّ عزیز و جلیل سے مانگ لے"۔ اسی سے ملتے جلتے الفاظ بخاری اور ابوداؤد کی روایات میں آئے ہیں۔ اِن ارشادات سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ حضورؐ یہ تو پسند فرماتے ہیں کہ تشہّد کے بعد آدمی اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگے (جس میں درود شامل ہے کیونکہ وہ بھی ایک دُعا ہی ہے)، لیکن اس کے الفاظ کا انتخاب خود دُعا مانگنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اب درود شریف کے مسئلے کو لیجیے۔ معترض کا کہنا یہ ہے کہ حضورؐ سے اُس کے جو الفاظ ماثور ہیں ان میں کوئی کمی بیشی کرنا مکروہ ہے۔ لیکن کیا واقعی فقہا کے درمیان یہ مسئلہ متفق علیہ ہے؟

امام ابوبکر بن مسعود کاشانی، جن کی کتاب بدائع الصنائع فقہ حنفی کی معتبر ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اِس مسئلے پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں ولا یکرہ ان یقول فیھا وارحم محمدًا عند عامۃ المشائخ، وبعضھم کرھوا ذلک...... والصحیح انہ لا یکرہ۔ "اور درود میں وارحم محمدًا کہنا اکثر اکابر علما کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور بعض اسے مکروہ کہتے ہیں...... مگر صحیح یہ ہے کہ وہ مکروہ نہیں"۔

درود میں سیدنا کا لفظ بڑھانے کے متعلق مشہور شافعی فقیہ شمس الدین الرّملی، جو چھوٹے شافعی کہلاتے تھے، اپنی کتاب نہایۃ المحتاج اِلیٰ شرحِ المنہاج میں لکھتے ہیں والافضلُ الاتیان بلفظ السیادۃ ......

لان فیہ الاتیانُ بما اُمرنا بہ وزیادۃ الاخبار بالواقع الذی ھو ادب، فھو افضل من ترکہ۔

"اور افضل یہ ہے کہ (درود میں) لفظِ سیادت لایا جائے ...... کیونکہ یہ ایسی چیز کا لانا ہے جس کے لیے ہم مامور ہیں اور اس میں اس امرِ واقعی کا مزید بیان ہے جو ادب ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑنے سے اس کا ادا کرنا افضل ہے۔"

صرف درود ہی نہیں، تشہُّد تک میں شوافع نے لفظ سیدنا کے اضافے کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اسی پر ان کا عمل بھی ہے۔ چنانچہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں شافعی مذہب کا جو تشہُّد درج کیا گیا ہے وہ اِن الفاظ پر ختم ہوتا ہے واشھدُ انّ سیّدنا محمّداً رسول اللہ، حالانکہ ابن عباس کے جس تشہُّد کو امام شافعی نے اختیار کیا ہے اس میں لفظ سیدنا نہیں پایا جاتا۔

علامہ ابن عابدین شامی کی کتاب ردّ المحتار فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں سے ہے۔ اس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رحمت کی دعا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعض علما نے اللّٰھم ارحم محمداً کہنے کو ناجائز کہا ہے، اور بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے، اور اسی دوسرے قول کو امام سرخسی نے ترجیح دی ہے۔ پھر درود میں لفظ سیدنا کے استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ہمارے (یعنی حنفیہ کے) مسلک کے خلاف ہے اور اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے تشہُّد میں کمی بیشی کو مکروہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اعتراض کمزور ہے، کیونکہ درود تشہُّد پر زائد ایک چیز ہے، اُس میں شامل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص تشہُّد میں اشھد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ کہے تو یہ ضرور مکروہ ہے، لیکن تشہُّد کے بعد جو درود پڑھا جاتا ہے اس میں یہ لفظ بڑھایا جا سکتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز میں جو درود پڑھا جاتا ہے اس کا درود کے ماثور الفاظ ہی میں پڑھا جانا لازم نہیں ہے، اور ان ماثور الفاظ میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر درود میں اللّٰھم ارحم محمداً، اور اللّٰھم صلّ علیٰ سیدنا محمدٍ کہنا مکروہ نہیں ہے تو سیدنا کے ساتھ مولانا کہہ دینے میں کراہت کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟

(بقیہ اشارات) شہری آزادیوں پر دوسری ضرب کاری، ہنگامی حالات کو دوام عطا کرکے لگائی گئی ہے۔ دستور کی رو سے حکومت اس بات کی پابند تھی کہ اگر وہ ہنگامی حالات میں توسیع کرانا چاہتی ہے تو اس مسئلہ کو ہر ششماہی کے بعد اسمبلی میں پیش کرکے توسیع حاصل کرے لیکن اب حکومت نے ایک ترمیم کے ذریعہ اس تکلف سے بھی اپنے آپ کو بے نیاز کرلیا ہے۔ وہ اپنے مصالح کے تحت جب تک چاہے ملک میں ہنگامی حالات برقرار رکھ کر لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھ سکتی ہے۔ اصحابِ اقتدار نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ملک کے نمائندوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں ارکان کی اکثریت ہنگامی حالات کی قرارداد منظور کرلے تو پھر ان کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ کیا موجودہ حالات میں کبھی اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ سینیٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں کوئی ایسی قرارداد منظور کی جاسکے گی جو بھٹو صاحب کے منشا کے خلاف ہو۔

ملک کو آمریت کی راہ پر ڈالنے والے ان متعدد دستوری تغیرات میں، جنہیں بڑی ہنرمندی کے ساتھ ترمیمات کا نام دیا گیا ہے، پولیٹیکل پارٹی ایکٹ بھی شامل ہے۔ یہ وہ ایکٹ ہے جو محمد ایوب خاں جیسے آمرِ مطلق کے عہد میں نافذ ہوا اور جسے ۱۹۷۳ء کے دستور میں تحفظ دیا گیا۔ اس ایکٹ کی رُو سے اگر حکومت کسی سیاسی جماعت کو ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث پائے تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کا معاملہ عدالتِ عظمٰی میں پیش کرے اور اس کے فیصلے کی روشنی ہی میں کوئی قدم اُٹھائے۔ پھر ارکانِ اسمبلی کو بھی یہ تحفظ دیا گیا تھا کہ انہیں اسمبلی کے اجلاس کے دوران یا چند روز پہلے یا چند روز بعد گرفتار نہیں کیا جاسکتا لیکن جمہوریت کے ان علمبرداروں نے فیلڈ مارشل صاحب کی آمریت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب ایک ترمیم کے ذریعے حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگیا ہے کہ وہ جس سیاسی پارٹی کو چاہے سپریم کورٹ سے پیشگی اجازت لیے بغیر کالعدم قرار دے دے اور اس کارروائی کے پندرہ روز بعد عدالت عظمٰی کی طرف رجوع کرے۔ کسی سیاسی جماعت پر اس سے بڑا ستم اور کیا ہوسکتا ہے کہ پہلے حکومت پوری قوت سے اس کا شیرازہ منتشر کردے، اس کے ارکان کو اپنے ظلم وستم کا تختہ مشق بنائے، اس کے فنڈز اور اس کی جائیداد ضبط کرلے اور پندرہ دنوں میں انتقام کی آگ بجھا کر پھر عدالتِ عظمٰی سے اپنی ان منتقمانہ کارروائیوں کی توثیق حاصل کرے۔ انصاف کا یہ کونسا انداز ہے کہ اس "معتوب" جماعت کے سربراہ تو جیلوں میں بند ہوں، فضا میں خوف و ہراس کی کیفیت

طاری ہو، حکومت کے ذرائع ابلاغ اس سیاسی جماعت کے قائدین کی کردارکشی میں بڑی بیباکی کے ساتھ مصروف ہوں اور پھر اس امر کی توقع کی جائے کہ اس جماعت کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سپریم کورٹ جیسی عظیم عدالت حکومت کی ان ساری کارروائیوں سے متاثر ہوئے بغیر صحیح فیصلہ کرے گی تو اس نقصان کی تلافی کی آخر کیا صورت ہوگی جو اس جماعت کو حکومت کے سپریم کورٹ تک پہنچنے اور حقائق کی چھان پھٹک کے بعد اس کے فیصلہ صادر کرنے تک پہنچ چکا ہوگا۔

ماہرینِ نفسیات نے انسانی ذہن کا عمیق مطالعہ اور مشاہدہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی انسان کی قلبی کیفیت اور اس کے اصل عزائم کو جاننے کے لیے اس کے نمایاں کارناموں کا جائزہ لینے کے بجائے اس کے غیر ارادی افعال اور روزمرّہ سرگرمیوں پر نگاہ رکھنی چاہیے کیونکہ وہ عظیم کارناموں کے پردے میں اپنی اصلی نیّت کو بآسانی چھپا سکتا ہے لیکن غیر اہم کاموں میں حقیقت خودبخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ جس طرح تنا ور درخت ہوا کے رُخ کا پتہ نہیں دیتے بلکہ تنکوں سے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے اسی طرح حکومت کے وسیع تعمیراتی منصوبوں اور بلند بانگ دعووں سے اس امر کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کے ذہن میں ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا کیا نقشہ ہے۔ اس کے جانچنے کے لیے تو ہمیں لامحالہ اس کی ان سرگرمیوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے جنہیں وہ بظاہر ملکی استحکام کی کوششوں سے تعبیر کرتی ہے مگر اِن کا اصل مقصد اپنے اقتدار کو دوام بخشنا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر آپ سمجھنا چاہیں تو دستور میں عاجلانہ ترمیمات کے علاوہ صوبہ سرحد میں گورنر راج کے نفاذ پر غور کریں۔ اس صوبے میں کسی مخالف سیاسی جماعت کی حکومت قائم نہ تھی بلکہ برسرِ اقتدار پارٹی ہی مسندِ اقتدار پر فائز تھی۔ پھر صوبائی کابینہ میں کوئی ایک وزیر بھی ایسا نہ تھا جس سے اس بات کا خطرہ ہوتا کہ وہ کبھی وزیراعظم کے کسی حکم کی تعمیل میں کوئی ادنیٰ تامل بھی کر سکے گا۔ سب وزرا ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جناب ذوالفقار علی بھٹو کے نیاز مند اور اپنی اس نیاز مندی پر فخر کرنے والے تھے۔ آخر کیا وجہ ہوئی کہ ان سب کو بیک بینی و دوگوش نکال باہر کیا گیا اور جمہوریت کے شیدائی نے اس کی بساط خود اپنے ہاتھوں سے لپیٹ کر وہاں گورنر راج کا تخت بچھا دیا اور اس کے یمین و یسار وہ مشیر جمع کیے جن کا پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان پر نگاہِ انتخاب کچھ دوسرے مصالح کے تحت پڑی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں

کہ بھٹو صاحب کو خود اپنی پارٹی پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا - یا وہ ہر فیصلہ کن مرحلے پر اپنی پارٹی سے یہ اندازِ بے نیازی اختیار کرکے اُسے باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی باندی ہے جس سے وہ جب چاہیں حسبِ منشا کام لے لیں اور جب چاہیں یکسر نظر انداز کر دیں۔ وہ ان سے کوئی تقاضا نہیں کر سکتی - عوام کے نمائندوں کی موجودگی میں غیر نمائندہ مشیروں کا تقرر اگر پیپلز پارٹی کی بے حُرمتی کے علاوہ ملک میں بڑھتے ہوئے آمرانہ رجحانات کا پتہ نہیں دیتا تو کس چیز کی نشاندہی کرتا ہے - اگرچہ یہ سب کچھ ملکی استحکام کے نام پر کیا گیا ہے اور حکومت کے حاشیہ بردار اور طالع آزما اس اقدام کی تائید میں بیانات پر بیانات دیتے چلے جا رہے ہیں لیکن جو لوگ اس ملک کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہیں انہیں ان تنکوں کی جنبش ہی سے ہوا کے رُخ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کہیں دوسرے صوبوں میں بھی ڈرامہ کھیلنے کی تیاریاں تو نہیں کی جا رہیں۔

ہم بھٹو صاحب کے بارے میں کوئی سوئے ظن نہیں رکھتے - ہمیں معلوم ہے کہ انہیں مُلکی استحکام بڑا عزیز ہے اور اسی استحکام کی خاطر انہوں نے بلوچستان کی نمائندہ حکومت ختم کر کے وہاں اقلیتی پارٹی کو صوبے کا نظم و نسق سونپ دیا ہے - اور اب اس امر کے لیے کوشش کی جا رہی ہے کہ اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائے تاکہ ان کی اس دلیرانہ کارروائی پر انگشت نمائی نہ کی جا سکے - غالباً وطن کی محبت ہی کی وجہ سے انہوں نے سرحد میں نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط وزارت کو برطرف کر کے وہاں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کی تھی جسے توڑ کر اب وہاں گورنر راج قائم کر دیا گیا ہے -

وزیر اعظم ملک کے اندر اور باہر جو کچھ بھی کر رہے ہیں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ہی کر رہے ہیں اور شاید پاکستانی قوم کی بہبود کی خاطر ہی گذشتہ سال انہوں نے کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا اور اس طرح قومی تقاضوں کے پیش نظر بھارتی جارحیت کے اس گھناؤنے جُرم کو فراموش کر کے اس سے تعلقات بحال کرنے میں پیش قدمی کی - ہم جانتے ہیں کہ وہ اس ضمن میں جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ قوم اور ملک کی سربلندی کے لیے ہی کر رہے ہیں لیکن ہم اس مرحلے پر ان کی خدمت میں یہ گذارش ضرور کرنا چاہتے ہیں کہ نیت خواہ کتنی ہی نیک ہو لیکن اس دنیا میں اگر معروف قواعد و ضوابط سے ہٹ کر کوئی کام کیا جائے تو اس سے انسان کا وقار گرتا ہے، مثلاً اگر نیکی کا کوئی علمبردار خلوص نیت کے ساتھ ایک پارسا کو اس بنا پر قتل کر دے کہ وہ پارسائی کے ساتھ شہادت کا بلند مرتبہ بھی حاصل کر لے تو اس کے اس فعل پر

خواہ اس کے پیچھے کتنا ہی مقدس جذبہ کارفرما ہو، لوگ نفرین ہی بھیجیں گے۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی سربراہ مملکت انتہائی نیک نیتی کے ساتھ ملکی استحکام اور قومی سربلندی کی خاطر عوام کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرتا ہے تو وہ خلوص نیت کے باوجود اپنے خلاف نفرت کے جذبات کی آبیاری کرتا ہے۔ دنیا میں وہی اخلاص قابل قدر ہے جس سے دوسرے انسانوں پر بلاوجہ کوئی آنچ نہ آئے۔

بھارت قوت وطاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر اپنے کمزور ہمسایوں خصوصاً پاکستان پر جو ظلم وزیادتی کر رہا ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک نہایت ہی سیاہ باب ہے۔ اگر بھارت کے رہنماؤں کے دل میں انسانیت کا کچھ بھی احترام اور انسانی حقوق کا کوئی پاس ہوتا تو وہ پاکستان کو تباہ کرنے کے بجائے اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے مگر افسوس وہ اوّل روز ہی سے اسے نیست ونابود کرنے کے درپے ہیں۔ صلح وآشتی کے ان دعویداروں نے پہلے جوناگڑھ پر قبضہ کیا، پھر حیدرآباد کی آزادی سلب کی اور کشمیر پر ہر اصول اور ضابطے کو پامال کرتے ہوئے قابض ہو گئے۔ ایک قوم کی اس سے بڑی اخلاقی گراوٹ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حیدرآباد پر تو یہ کہہ کر قبضہ کرے کہ کسی ریاست کا الحاق اس ملک کے باشندوں کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے لیکن اپنے اس اصول اور ضابطے کے بالکل برعکس کشمیر پر اپنا تسلط اس بنیاد پر قائم کرے کہ اس کے مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کی درخواست دی ہے۔ دنیا میں آج اگر حق وانصاف کی فرمانروائی ہوتی تو پوری انسانیت مل کر اس ظلم کے خلاف جدوجہد کرتی لیکن بدقسمتی سے آج کی دنیا میں جبر واستبداد کی حکمرانی ہے اور قوموں کی باہمی آویزش نے انہیں اس حد تک مفاد پرست بنا دیا ہے کہ وہ کسی معاملے کو حق وانصاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ مادی مفادات کے مطابق طے کرتی ہیں۔ بھارت چونکہ اس وقت پاکستان کے مقابلے میں بڑی طاقت ہے اس کے علاوہ پاکستان جس نظریاتی بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہے اس سے مغربی دنیا کو خطرہ لاحق ہے اس لیے وہ بھارت کے ہر اس اقدام کی تائید وحمایت کرتی ہے جس سے پاکستان کا شیرازہ منتشر ہو۔ دنیا کی اخلاقی بے حسی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں اور کشمیر کے معاملے میں اپنے سارے مواعید کو یکسر نظر انداز کر کے اس مظلوم وادی پر پچھلے ستائیس سالوں سے قابض چلا آ رہا ہے اور کوئی اس سے بازپرس نہیں کرتا۔ اقوام متحدہ کی

کمزوریاں اور مجبوریاں اپنی جگہ سہی لیکن ہم یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں کہ اگر مظلوم قوموں کو انصاف دلوانے والا یہ ادارہ نیک نیتی سے مسئلہ کشمیر کو حل کرنا چاہے تو حل نہ کرا سکے۔ بھارت میں ابھی اتنا دم خم پیدا نہیں ہوا کہ وہ بڑی طاقتوں کے مطالبہ کو مسترد کر دے لیکن افسوس کہ بڑی قومیں ہی اس ظلم میں بھارت کی پشت پناہ ہیں اور وہ ان کی تائید سے پاکستان کے ایک حصہ پر بالکل ناجائز طور پر ربع صدی سے تسلط قائم کیے ہوئے ہے۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اندرا گاندھی گٹھ جوڑ کے اس نازک مرحلے پر ہڑتال کا اعلان کر کے ایک بار پھر انسانیت کے ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے اور اس منظم ہڑتال سے یہ مسئلہ از سرِ نو تازہ ہو گیا ہے۔ لیکن ہم اس سلسلے میں وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ محض ہڑتالوں سے کبھی حل نہ ہوگا اس کے لیے بڑی احتیاط، دانشمندی اور ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے۔ یہ بات ہمارے فہم سے بالاتر ہے کہ عین اس وقت جب بھارت کشمیر کو ہمیشہ کے لیے ہڑپ کرنے پر تلا ہوا ہے ہماری حکومت اس ظالم ملک کے ساتھ تجارتی تعلقات بحال کرنے میں کیوں سرگرمی دکھا رہی ہے؟ بھارت اس وقت شدید نوعیت کے غذائی اور صنعتی بحران سے دوچار ہے اور ان پر آشوب حالات میں اس کے مربی اور محسن بھی اس کی اعانت اور دستگیری کے لیے آمادہ نہیں ہو رہے۔ وہ اسے اسلحہ دینے پر تو تیار نظر آتے ہیں مگر غلہ اور خام مال دینے میں کافی لیت ولعل سے کام لے رہے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ چونکہ یہ بحران اب بھارتی معیشت کا مقدر بن چکے ہیں اس لیے ان دائروں میں اُن کی کوئی وقتی امداد اس کی معیشت میں کوئی استحکام پیدا نہیں کر سکتی۔ اُن کے نزدیک بھارت کو معاشی اعتبار سے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اُسے فوجی اعتبار سے اس قدر طاقتور بنا دیا جائے کہ وہ قوت کے زور سے غلے اور خام مال کی منڈیوں پر قبضہ کرے اور ان سے خود بھی فائدہ اُٹھائے اور اپنے محسنوں کو بھی فائدہ اُٹھانے کے بھرپور مواقع فراہم کرے۔ بنگلہ دیش کی معیشت بھارت کے ہاتھوں جس طرح تاراج ہو رہی ہے اس سے بھارت اور اس کے سرپرستوں کے عزائم کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی بصیرت اپنی جگہ مسلّم، اُن کی سیاسی سمجھ بوجھ بھی قابلِ ستائش لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ بھارت کو جس غذائی اور صنعتی بحران سے

نکالنے کے لیے اس کے جگری دوستوں تک نے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہے اور اسے آس پاس کی کمزور قوموں کے قدرتی وسائل پر بالجبر قبضہ کرنے کی راہ دکھائی ہے۔ اس میں ہم اس کی اعانت کے لیے کیوں اتنے فکرمند نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں بھارت اور ہمارے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے سخت مجبوری کے عالم میں اور اپنے بہی خواہوں سے یکسر مایوس ہو کر محض اپنے غذائی اور صنعتی بحران پر قابو پانے کے لیے پاکستان کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار کرنا گوارا کیا ہے۔ ان تعلقات نے اس کی ذہنی کیفیت کس حد تک تبدیل کی ہے، اس کا اندازہ اس زبردست احتجاج سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے ہتھیاروں کے معاملے میں امریکہ کے موقف میں معمولی سی تبدیلی پر کیا ہے درآنحالیکہ اس کے اپنے ہاں ہتھیار تیار کرنے کی اکتیس فیکٹریاں دن رات کام کر رہی ہیں اور روس اسے مسلسل بے حد و حساب اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم وزیر اعظم کی خدمت میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے حاشیہ نشینوں نے سیاسی مخاصمت کی بنا پر میاں طفیل محمد صاحب، امیر جماعت اسلامی کی جس معقول تجویز کا حلیہ بگاڑ کر اس کا استخفاف کیا ہے وہ مسئلہ کشمیر کے حل میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ کشمیر کا مسئلہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اس لیے یہ بات اربابِ اختیار کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی ہے کہ چونکہ یہ تجویز حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت نے پیش کی ہے اس لیے اسے لازمی طور پر مسترد ہی کرنا چاہیے۔ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور بھارتی جارحیت کو سندِ جواز دینے کے لیے دنیائے اسلام کا جاہ و جلال جمع کیا جا سکتا تھا تو آخر کشمیری مسلمانوں کی مظلومیت کا مداوا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کیوں نہیں بلائی جا سکتی۔ خدا کا شکر ہے کہ عالمِ اسلام میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ان کے اندر اپنی قوت کا احساس بھی بڑی تیزی کے ساتھ اُبھر رہا ہے۔ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک نے پچھلے دنوں تیل کے ہتھیار کو جس ہنرمندی اور اعتماد کے ساتھ استعمال کیا ہے اس سے بڑی بڑی قومیں بوکھلا اٹھی ہیں۔ ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اگر یہ سارے مسلم ممالک مل کر بھارت کو راہِ راست پر لانے کا ارادہ کر لیں تو انہیں کامیابی نصیب نہ ہو۔

مطبوعات

مسعود عالم ندویؒ تالیف: جناب اختر راہی ایم اے۔

شائع کردہ: مکتبۂ ظفر، ناشران قرآنی قطعات۔ محلہ فیض آباد۔ گجرات

ضخامت: ۱۰۳ صفحات قیمت: ۶/ روپے

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم و مغفور کی شخصیت دنیائے اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ علوم اسلامی، خصوصاً تاریخ اسلام کے ایک مستند عالم عربی زبان کے بلند پایہ ادیب اور اُردو زبان کے منجھے ہوئے انشاء پرداز تھے۔ وہ برصغیر پاک و ہند کی تحریک اسلامی جسے جماعت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کشتیاں جلا کر شامل ہونے اور اپنی عمر عزیز کے آخری دس سال اس کی خدمت میں اس طرح منہمک ہوئے کہ ہر دوسرے انہماک کو اس پر رشک آتا تھا۔ انہوں نے صحت کی خرابی کے باوجود اپنے لائق تلامذہ خاص طور پر محمد عاصم الحداد کی مدد سے، اس تحریک کو دنیائے عرب میں متعارف کروایا۔ اس تحریک کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کی وفات کو کس شدت سے محسوس کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے کیا جا سکتا ہے:

"مسعود عالم صاحب کی وفات پر اس کے سوا کیا لکھوں کہ اس کے بعد سے اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاید جسم کے بازو ٹوٹنے کی بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی روح کے اس بازو کے ٹوٹ جانے سے محسوس ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل عطا فرمائے اور اپنے دین کے لیے ویسا ہی کوئی خادم پیدا کرے۔ بظاہر تو یہ جگہ پُر ہونی مشکل ہے۔"

زیر تبصرہ کتاب میں مولانا کی زندگی کو بڑے سلیقے کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے اور اس میں ان پہلوؤں کو خاص طور پر اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے تعمیر سیرت اور جذبہ خدمت دین پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ ان کے خطوط پر مشتمل ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں کو لکھے ان خطوط کے مطالعہ سے یوں تو مولانا کے فکر و نظر کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں لیکن ان میں ایک بات بڑی نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ ان خطوط کا لکھنے والا ایک نہایت ہی مخلص، اپنے ارادے کا پکا اور صاف ستھرے ذہن کا انسان ہے۔

علمی ذوق اور لائبریری کی زینت کے اضافہ کے لیے

اعلیٰ کتب

- انتخابِ حدیث — مولانا عبدالغفار حسن 10/50 روپے
- راہِ عمل (مجموعہ انتخابِ حدیث) مولانا جلیل احسن ندوی 7/- "
- آدابِ زندگی — مولانا محمد یوسف اصلاحی 13/50 "
- [illegible] — علامہ حافظ ابنِ تیمیہ، ترجمہ مولانا عقیل احمد حامدی 10/- "
- حیاتِ طیبہ — ابو سلیم محمد عبدالحی 7/25 "
- محمد عربیؐ — محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی 6/- "
- ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ — ثروت صولت
  - حصہ اول 5/50 "
  - حصہ دوم (زیرِ طبع) 3/- "
  - حصہ سوم 12/25 "
- تاریخ افکار و علوم اسلامی — علامہ راغب الطباخ
  - ترجمہ: افتخار احمد بلخی — حصہ اول 10/- "
  - حصہ دوم 21/- "
- دین کی باتیں — ابو سلیم محمد عبدالحی 6/28 "
- سرورِ عالمؐ — سید ابوالاعلیٰ مودودی /- "
- تنقیحات — مولانا امین احسن اصلاحی /-
- دین کی حفاظت — ابو سلیم محمد عبدالحی (بسلسلہ خواتین) 4/-
- ایمان کی حقیقت — ابو سلیم محمد عبدالحی 4/-
- اسلام اور اجتماعیت — مولانا صدرالدین اصلاحی 8/- روپے
- حقیقتِ نفاق — " 2/75 "
- اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ — افادات شاہ ولی اللہ، ترجمہ مولانا صدرالدین اصلاحی 3/- "
- رسائل و مسائل — سید ابوالاعلیٰ مودودی
  - حصہ اول 15/- "
  - " دوم 19/75 "
  - " سوم 15/00 "
  - " چہارم 12/50 "
- مسلمانوں کے شب و روز — سید اسعد گیلانی 8/- "
- کشف المحجوب — ترجمہ و ترتیب میاں طفیل محمد، تالیف سید علی ہجویریؒ 19/50 "
- مکتوباتِ حضرت علیؓ — ترجمہ و ترتیب — [illegible] رامپوری 5/50 "
- عرب اور اسلام — پروفیسر ہارون الرشید
  - جلد اول: نظم 7/50 "
  - جلد دوم: نثر 5/50 "
- برنباس کی انجیل — آسی ضیائی رامپوری 13/50 "
- مولانا مودودی — پروفیسر خورشید احمد 14/- "
- خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ — ملک غلام علی 25/- "

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ — ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

(فون: [illegible])